یہودی مغرب اور مسلمان

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیه ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

یہودی مغرب اور مسلمان

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

یہودی مغرب اور مسلمان

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

اسلامک بک فاؤنڈیشن

۱۷۸۱-حوض سوئیوالان، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

Name of the Book	:	**Yahoodi Maghrib aur Musalman**
Name of Author	:	Dr. Obaidullah Fahad Falahi
Edition	:	1434 AH / 2013 AD
Published By	:	**Islamic Book Foundation** An Institute of Islamic Research & Publication 1781, Hauz Suiwalan, New Delhi - 110002
Pages	:	266 (256+8)
Price	:	Rs. 200/-

نام کتاب	:	یہودی مغرب اور مسلمان
مصنف	:	ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
سن اشاعت	:	۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء
صفحات	:	۲۶۴ (۲۵۶+۸)
قیمت	:	200/روپے
مطبع	:	ڈائمنڈ پرنٹرز، نئی دہلی
ناشر	:	

اسلامک بک فاؤنڈیشن

۱۷۸۱۔حوض سوئیوالان، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

Mob : 09313780743

Email : ibookfoundation@gmail.com

Islamic Book Foundation

AN INSTITUTE OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATIONS

1781, Hauz Suiwalan, New Delhi - 110002

انتساب

ماہنامہ حیات نو

(جامعۃ الفلاح)

اور اس کے اوّلین مدیر مسئول

مولانا انصار احمد فلاحیؒ

(۱۹۵۲ء-۲۰۰۰ء)

کے نام

عبید اللہ فہد فلاحی

فہرست

حصہ دوم- سیاسی وعسکری یلغار

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چند باتیں

اسلام اور مغرب کے حوالے سے جب گفتگو کی جاتی ہے تو عام طور سے مغرب سے مراد یوروپ کا خطہ ہوتا ہے جو عیسائیت کا علم بردار ہونے کے باوجود مسلمانوں کے تئیں تعصب، دشمنی اور نفرت کا معاملہ کرتا رہا ہے اور جس نے اپنی تہذیب وثقافت اور اقدار و روایات کی عالمی برتری کا دعویٰ کیا۔ ہے خواہ ریاست ہا۔ ئے متحدہ امریکہ، برطانیہ وفرانس کا معاملہ ہو یا روس اور چین جیسی استعماری طاقتوں کا۔ جغرافیائی حد بندی سے اوپر اٹھ کر تہذیبی وثقافتی بنیادوں پر ہونے والی یہ تقسیم اسلامی ادبیات میں نمایاں ہے۔ مصر جدید کے ممتاز محقق اور ادیب احمد امین (۱۸۸۶-۱۹۵۴ء) اپنی مشہور تصنیف الشرق والغرب میں فکری وثقافتی تقسیم پر ہی زور دیتے نظر آتے ہیں۔[۱]

بیس سال پہلے تک دنیا میں دو استعماری طاقتیں تھیں جو سیاسی وسفارتی سطح پر باہم معرکہ آرا تھیں اور دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے ایک دوسری کو نیچا دکھانے میں مصروف تھیں۔ امریکہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا علم بردار تھا جبکہ سوویت یونین کا معاشی نظریہ اشتراکی تھا۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ دونوں استعماری طاقتیں تھیں اور دنیا میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیے ہوئے تھیں۔ ۶۵ سال تک دونوں قوتوں کے درمیان یہ جنگ جاری رہی مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں طاقتیں باہم دست وگریباں ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یکساں درجے میں نفرت اور عداوت رکھتی تھیں جس کی نمایاں مثال مملکت اسرائیل کے قیام واستحکام میں دونوں عالمی طاقتوں کا یکساں کردار ہے

اب سوویت یونین کا سقوط ہونے کے بعد امریکہ یک قطبی استعمار کی شکل اختیار کر چکا ہے اسے کسی حریف کی مداخلت کا اندیشہ ہے نہ کسی بڑی طاقت کی مزاحمت کا خطرہ۔ چین کی جانب سے کچھ خدشات اسے ضرور لاحق ہیں اور اسی کے پیش نظر وہ ایشیا میں محتاط پالیسیاں وضع کر رہا ہے مگر اسلام اور مسلمان بے خوف وخطر اس کا واحد ہدف ہیں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر اس نے اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان اس جنگ میں کیا کردار ادا کریں؟ کیا وہ اس تمام تر نفسیاتی، سیاسی وحربی دباؤ کے باوجود دین سے دست کش ہونے کے لیے تیار ہیں؟

یہودی مغرب کی کارستانی

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی یہ ہمہ جہتی کشمکش، جس میں امریکہ اور سوویت یونین کے دونوں بلاک شامل رہے ہیں، یہود کے عالمی غلبہ کی سازش کا حصہ ہے۔ یہودیوں نے مکروفریب کے پردے میں، جدید مادی افکار کے جلو میں مذہب وروحانیت کے نام پر ہونے والی ہر مبارک جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی ہے اسی لیے دور جدید کی تمام مخرب اخلاق تحریکوں اور نظریات کے پس پردہ یہودیوں کی کارفرمائی صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ عالمی استعمار کے حربی وسفارتی، فکری وثقافتی تمام اسلوب ومنہج یہودیوں کے ذہن کی پیداوار ہیں اس پس منظر میں مغرب کے ساتھ ''یہودی'' کا لاحقہ بالکل درست نظر آتا ہے۔ یہودی مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو ناپاک سازش رچی ہے اسے اللہ رب العزت نے صدیوں پہلے بے نقاب کر دیا تھا جب قرآن نے یہ اعلان کیا تھا:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ۔[۲]

''تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکوں کو پاؤ گے۔''

قرآن نے یہودیوں اور مشرکین کا تذکرہ ایک ساتھ کیا ہے اور دونوں کو اسلام دشمنی میں ہم مشرب

اور ہم آہنگ قرار دیا ہے۔

دور رسالت میں یہود کی ذہنی پستی کا عالم یہ تھا کہ وہ مشرکین مکہ سے دوستی گانٹھتے تھے اور انہیں مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ ہدایت یافتہ تصور کرتے تھے۔ اہل کتاب ہونے کے باوجود اُن کی اس اسلام دشمنی پر قرآن نے اظہار تعجب کیا اور ان کی اس حرکت پر لعنت بھی کی۔ سورہ نساء میں اس یہودی ذہنیت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے فرمایا:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيباً مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَؤُلاءِ أَهْدَى مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلاً۔ أُولَئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۔[۳]

''کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا اور وہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کفار کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں۔ یہی ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔''

آج یہود کی یہ اسلام دشمنی پوری طرح عیاں ہے۔ استعماری مغرب پر یہود پوری طرح مسلط ہیں۔

کتاب کی تنظیم

اسلام اور مسلمانوں کے تئیں یہودی مغرب کی کارستانیوں کو زیر بحث کتاب میں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ یہودی مغرب کی استعماری ذہنیت کے فکری وثقافتی پہلو سے بحث کرتا ہے۔ استعمار نے اپنے ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے تہذیبی وفکری یلغار کا سہارا لیا ہے۔ سگمنڈ فرائڈ کی جنسیت ہو یا سرمایہ دارانہ معیشت اور اشتراکی معاشی نظام ہو، یہودیوں کی سیاسی وسفارتی مکاری ہو یا فکری تخریب، سب کا ہدف اسلام اور مسلمان رہے۔ فتنۂ استشراق نے بھی کم گل نہیں کھلایا اس نے اکثر استعمار ہی کا کردار ادا کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ مغرب کی عسکری و سیاسی یلغار پر مشتمل ہے۔ عالم عرب اور عالم اسلام کے قلب فلسطین میں کس طرح مغرب و مشرق کی دو عظیم طاقتوں نے مل کر مملکت اسرائیل کے ناجائز وجود کو تقویت دی اور آج تک مغرب کی تمام قوتیں مل کر فلسطین میں مسلمانوں کا خون بہا رہی ہیں اور انہیں اپنی پسند کی حکومت اور معاشرت کی تشکیل کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حماس اور تنظیم آزادی فلسطین میں خوفناک تشدد آمیز جھڑپوں کے پیچھے دراصل انہی طاقتوں کی سازش کام کررہی ہے۔ سوویت یونین کا سقوط ہوگیا اور بعض مسلمان ممالک کسی حد تک آزاد بھی ہوگئے مگر وہاں بھی روسی استعمار نے انہیں آزادی سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ دیا اور وہ تمام نو آزاد ریاستیں اپنے سیاسی و معاشی اور فکری و تہذیبی بحرانوں کے تلے سسک رہی ہیں۔ حقوق انسانی کا سب سے بڑا علم بردار ملک امریکہ آج مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے ہے اور اپنے دائرہ اقتدار میں مسلمانوں پر شکنجہ کسنے کے ساتھ عالم عرب میں بھی بدترین آمروں کو مسلط کیے ہوئے ہے۔ حالانکہ اب ان آمروں کے خلاف حاکمیت جمہور نے انگڑائی لے لی ہے۔ کئی آمروں کا تختہ پلٹا جاچکا ہے۔ بقیہ روز حساب کے منتظر ہیں۔

منہج بحث

پیش نظر کتاب مختلف مقالات کا مجموعہ ہے جو پچھلی تین دہائیوں میں مختلف اخبارات و رسائل اور جرائد کی زینت بنے۔ اب انہیں افادۂ عام کی خاطر یکجا شائع کیا جارہا ہے۔ پہلا مقالہ سہ روزہ دعوت دہلی کے خصوصی شمارہ ۷/مارچ ۲۰۱۰ء میں شامل تھا جو عالمی استعمار اور ہندوستان کے مخصوص موضوع پر ترتیب دیا گیا تھا۔ دوسرا مقالہ 'نمود صبح' کے عنوان سے ماہنامہ حیات نو، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ کی تین اشاعتوں میں طبع ہوا ہے: جولائی-ستمبر ۱۹۷۸ء اکتوبر-نومبر ۱۹۷۸ء کے شماروں میں تین قسطوں میں جبکہ راقم نے لکھنا شروع کیا تھا اور حیات نو کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ تیسرا مقالہ بھی اسی ماہنامہ کی چھ اشاعتوں میں چھپا، جولائی

۱۹۷۹ء، ستمبر ۱۹۷۹ء، جنوری ۱۹۸۰ء، فروری ۱۹۸۰ء، ستمبر - اکتوبر ۱۹۸۰ء اور جون - جولائی ۱۹۸۱ء کے صفحات اس کے شاہد ہیں یہ ساری قسطیں فرائڈ کے جنسی نظریہ کی تنقید میں ہیں جو نفس کو ہر بندش سے آزاد کر دیتا ہے اور اس کی پوشیدہ جبلتوں سے نفسیاتی دباؤ اور اِخفا کو ختم کر دیتا ہے۔ نفسیات کی زبان میں انسان کے جذبات و اعمال پر خارجی کنٹرول اور گرفت اِخفا (Suppression) کہلاتی ہے اور یہی اِخفا رفعت کا سبب بنتی ہے۔ دوسری طرف راہبانہ طرز فکر و عمل ہے جو انسان کی حیوانی قوتوں پر پہرے لگا دیتا ہے اور انہیں بالکل کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اسلام ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کا راستہ دکھاتا ہے۔

چوتھا مقالہ پروفیسر شبیر احمد منصوری، مدیر اعلیٰ القلم لاہور کے لیے لکھا گیا تھا۔ انہوں نے از راہ کرم مجلس ادارت کا ایک حقیر رکن اس راقم کو بھی بنا رکھا ہے۔ شرمندگی مٹانے کے لیے راقم نے ایک طویل مضمون انہیں ارسال کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے پروفیسر سر تھامس واکر آرنلڈ کو منتخب کیا فتنۂ استشراق کے تجزیہ کے لیے۔ آرنلڈ کو علی گڑھ نے بے پناہ اپنائیت دی۔ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی سے لے کر مولانا الطاف حسین حالی تک ہر ایک نے ان کی قصیدہ خوانی کی مگر یہ ارباب کمال بھی ان کی استعماری ذہنیت تبدیل نہ کر سکے۔ سہ روزہ دعوت دہلی کے ۲۲ راگست ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں یہودیت پر عربی سے ترجمہ شدہ جو مضمون شائع ہوا تھا وہ اس کتاب میں پانچویں مقالہ کے طور پر شامل ہے جبکہ چھٹا مقالہ ماہنامہ زندگی نو، نئی دہلی دسمبر ۱۹۹۱ء کے شمارہ میں طبع ہو چکا ہے۔ مخدومنا المکرّم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی دعوت پر یہ مضمون عالمی سیرت کانفرنس منعقدہ ۲۷-۲۸ راکتوبر ۱۹۹۱ء جامعہ سلفیہ بنارس میں پڑھا گیا تھا۔ جو مجموعہ مقالات سیرت کانفرنس 'مقالات سیرت طیبہ' جمادی الآخرۃ ۱۴۱۵ھ رنومبر ۱۹۹۴ء میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس مضمون کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور بعض محققین نے اس کے حوالے بھی دیے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں شامل ساتواں مضمون أخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ ۲۳ راپریل ۱۹۷۹ء کے شمارہ میں شائع شدہ ڈاکٹر عبداللہ عزام کے عربی مضمون کی اردو ترجمانی

ہے جو حیات نو جلد دوم شمارہ ۵-۶ مئی- جون ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شامل تھی ۔ آٹھواں مضمون سہ روزہ دعوت دہلی ۲۵/ اگست اور ۲۸/ اگست ۱۹۸۶ء کے دو شماروں میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ سعد مصلوح کے اُس مقالہ کی تلخیص ہے جو المسلمون فی روسیابین حکم القیصریة و حکم الشیوعیة کے عنوان سے رسالہ الدعوة قاہرہ مارچ ۱۹۷۹ء میں طبع ہوا تھا۔ آخری مقالہ دعوت دہلی کی خصوصی اشاعت ۲۷/ جولائی ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دعوت کی یہ خصوصی پیشکش انسانی حقوق کے موضوع پر تھی جو کافی پسند کی گئی۔

اظہارِ تشکر

میں مشکور ہوں فاضل مدیران گرامی کا جنھوں نے اپنے رسائل و جرائد میں اِن خام افکار کو جگہ دی اور انہیں قارئین تک پہنچایا اور سب سے اہم بات یہ کہ ناچیز کی ہمت افزائی کی۔ ماہنامہ حیات نو کے محترم ومکرم مدیر مولانا انصار احمد فلاحی، مولانا نور محمد فلاحی (جواب جوار رحمت الٰہی میں جاچکے ہیں اور ان کی پر کیف صحبتیں اور شیریں یادیں ہی باقی ہیں) اور مولانا جاوید اشرف فلاحی مدنی بطور خاص تشکر کے مستحق ہیں جنھوں نے میری کچی پکی ہر تحریر کو اپنی ادارت کے زمانے میں رسالہ کے صفحات میں جگہ دی اور اس کی توقع سے زیادہ تحسین کی۔ آخر الذکر کی محبت اور اپنائیت مجھ پر اُس وقت سے سایہ فگن رہی جبکہ حیات نو ابھی رحم مادر میں پرورش پا رہا تھا یعنی سائیکلو اسٹائل مشین کے ذریعہ اس کی ترسیل ہو رہی تھی۔ سہ روزہ دعوت دہلی نے میری مختلف تحریریں شائع کیں جس کے لیے اس کے عالم مدیر جناب پرواز رحمانی اور مجلس ادارت کے تمام اراکین بالخصوص جناب شفیق الرحمٰن اور محمد شعیب کوٹی کا شکریہ ادا کرنا راقم پر واجب ہے۔ ماہنامہ زندگی نو نئی دہلی کے فاضل مدیر پروفیسر فضل الرحمٰن فریدیؒ (م ۲۰۱۱ء) کی شخصیت میرے لیے ہمیشہ فکر وعمل کے تمام میدانوں میں منارۂ نور کی رہی اللہ نے انہیں تحریکی شعور اور دینی بصیرت سے نوازا تھا۔ ماہنامہ کے اشارات کے ذریعہ وہ تاحیات امت مسلمہ کی دینی رہنمائی کرتے رہے۔ ضرورت

ہے کہ ان اشارات کے سارے مضامین کتابی شکل میں شائع ہوں اور ان کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز پنجاب یونیورسٹی لاہور، پروفیسر شبیر احمد منصوری کا بہت ممنون ہوں کہ راقم کی بے علمی اور بے بضاعتی کے باوجود اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی تحریروں کی قدر افزائی کرتے ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن خالد فلاحی کے تئیں کسی ممنونیت اور تعلق خاطر کے اظہار کے لیے الفاظ ناکافی ہیں الفاظ سے اُن جذبات و احساسات کی ترجمانی نہیں ہوسکتی جو میں اپنے دل میں ان کے لیے رکھتا ہوں۔ اللہ انہیں خوشحال رکھے اور ہر قسم کی سعادت سے بہرہ ور کرے۔ جناب محمد حفیظ نے کتاب میں شامل بعض احادیث اور آثار صحابہ کی تخریج میں تعاون دیا ہے اور ڈاکٹر شائستہ پروین نے از راہ کرم پورے مسودہ کی پروف خوانی کی ہے۔ راقم ان سب احباب کی محبتوں کا مقروض ہے اور ان کے تعاون کا معترف۔

عبیداللہ فہد فلاحی

۸/ اگست ۲۰۱۲ء

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

قصر فہد

یونیورسٹی فورٹ انکلیو

برولی روڈ، علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۲

انڈیا

Email: drfahadamu@yahoo.com

حواشی وتعلیقات

۱۔ احمد امین کی حیات اور افکار کے تجزیاتی مطالعہ کے لیے دیکھیے:

Shepard. William. The Faith of a Modern Muslim Intellectual- The Religious Aspects and Implications of the Writings of Ahmad Amin, Vikas Publishing House, New Delhi. 1982.

۲۔ قرآن کریم، المائدہ:۸۲

۳۔ قرآن کریم، النساء:۵۱-۵۲

☆☆☆

مغربی استعمار اور اس کے حربے

استعمار کی تاریخ

حدود سلطنت اور اقتدار کی توسیع کرنے کی کسی ریاست کی فکر، پالیسی، عمل یا وکالت استعمار کہلاتی ہے۔ اس توسیع پسندی میں براہ راست جغرافیائی تسلط شامل ہو یا دوسرے خطوں کو سیاسی و معاشی اعتبار سے قابو میں کرنے اور انہیں اپنا ماتحت بنانے کی سازش کارفرما ہو، دونوں استعمار کی شکلیں ہیں اور سامراجی ذہنیت میں شمار ہوتی ہیں۔ چونکہ اس میں ہمیشہ فوجی طاقت یا سیاسی دبدبے کا استعمال ہوتا ہے اس لیے انسانی تاریخ میں استعمار کو ہمیشہ ناپسندیدہ سمجھا گیا اور اسے ظالمانہ اقدام اور فکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر کسی ملک پر تنقید کرنے یا اس کے خلاف محاذ بنانے کے لیے اس کے اقدامات کو استعماری قرار دے کر رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دور قدیم میں استعمار کی تاریخ ہمیں نظر آتی ہے۔ چین میں، مغربی ایشیا اور بحر روم کے خطوں میں جہاں یکے بعد دیگرے مختلف ملکوں نے اپنا تسلط جمالیا اور اپنے توسیعی مقاصد کی تکمیل کی۔ آشوریوں کی استبدادی حکومت چھٹی صدی سے چوتھی صدی قبل مسیح کے دورانیے میں منظر عام سے غائب ہوئی تو ایرانیوں کا تسلط ہوا، جنہوں نے اس طویل عرصے میں عوام کے ساتھ قدرے منصفانہ برتاؤ کیا اور ان کے مسائل میں دلچسپی لی اور وسیع المشربی کا مظاہرہ کیا۔ عملاً اس سے یونانیوں کی استعماری ذہنیت کو راہ ملی۔ الیکزنڈر اعظم کے دور حکومت میں (۳۵۶-۳۲۳ق م) یونانی استعمار اپنے عروج پر تھا کیوں کہ اس دور میں بحر روم کے مشرقی خطے مغربی ایشیا سے مل کر یونان کی سلطنت کو مستحکم بنا رہے تھے۔ تاہم ایسا خطہ جس میں دنیا کے تمام شہری ہم آہنگی اور خیر سگالی کے جذبے سے رہ سکیں اور مساویانہ برتاؤ کے مستحق قرار پائیں، الیکزنڈر کے لیے ایک

خواب ہی رہا۔ بعد میں رومیوں نے برطانیہ سے مصر تک ایسی وسیع سلطنت قائم کی، جو اتحادِ اقوام کے لیے ماڈل بن سکے اور مختلف نسلوں اور تہذیبوں کو ایک وحدت میں پرو سکے، ایسی سلطنت مغرب کی پوری تاریخ میں پھر وجود میں نہ آ سکی۔ استعمار نے پوری تاریخ میں تقسیم و انتشار اور تزلزل کا کام کیا۔ خود مسیحیت کی پوری تاریخ میں استعماری فکر کبھی وحدت اور استحکام پیدا نہ کر سکی۔

دورِ جدید میں تین مراحل ایسے ہیں جن میں مختلف نوآبادیاتی طاقتیں دنیا کے نقشے پر ابھریں اور انہوں نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لیے قوت و طاقت اور سیاسی و معاشی استحصال کا سہارا لیا۔ پندرھویں صدی اور اٹھارھویں صدی کے وسط کے درمیانی وقفے میں انگلینڈ، فرانس، نیدرلینڈ، پرتگال اور اسپین نے امریکہ، ہندوستان اور ایسٹ انڈیز میں اپنی وسیع سلطنتیں قائم کیں۔ ایک صدی بعد استعماری سلطنتوں کے قیام کے میدان میں ہر سو سناٹا نظر آتا ہے۔ شاید اس کی وجہ استعمار کے خلاف مزاحمت کی مقبولیت اور عوام میں سیاسی و معاشی اور تعلیمی بیداری ہے۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے وسط اور عالمی جنگِ عظیم اول کے درمیان کئی دہائیاں استعماری فکر اور پالیسی کی رہین نظر آتی ہیں۔

روس، اٹلی، جرمنی، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جاپان بھی استعماری ریاستوں کی فہرست میں آ گئے۔ انہوں نے براہ راست اور زیادہ تر اقتصادی استحصال کے ذریعے اپنی استعماری فکر کو فروغ دیا اور دنیا کے بیشتر خطوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد مجلس اقوام کی تشکیل ہوئی تو ایک بہتر عالمی نظام کی توقعات پھر انگڑائیاں لینے لگیں۔ استعماری طاقتوں کو اپنے مقاصد کی تکمیل میں سدِّ راہ نظر آیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ کسی عالمی مجلس اقوام کی تشکیل و استحکام سے ان کے خواب چکنا چور ہو سکتے ہیں۔ اسی اثنا میں جاپان نے ۱۹۳۱ء میں چین پر حملہ کر کے اپنی استعماری سلطنت کی تجدید کی۔ آمرانہ اور استبدادی حکومتوں جاپان، فاشسٹ اٹلی، نازی جرمن اور سوویت یونین کی سربراہی میں ایک نئے استعمار کا تعارف ہوا، جس نے بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں استعمار کے ایک نئے باب کو وا کیا۔

استعمار کی حمایت میں استدلال

دور جدید میں استعمار پر ہونے والی بحثوں، تحریروں اور بیانات کو ہم چار بڑے درجات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا گروپ ان مفکرین اور دانشوروں کا ہے جو معاشی مسائل کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں اور استعمار کے اسباب وعوامل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ان کے خیال میں انسانی اور مادّی وسائل، سرمایہ کاری اور قدرزائد آبادی کی فراہمی سے، جو ایک استعماری ملک کا عام طور سے عطیہ ہوتی ہے، مثبت معاشی ارتقا کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ان حامیانِ استعمار کے علی الرغم مفکرین کا ایک دوسرا گروپ بھی ہے جیسے آدم اسمتھ (۱۷۲۳-۱۷۹۰)، ڈیوڈ ریکارڈو (۱۷۷۲-۱۸۲۳ء) اور جے اے ہالبسن، جنھوں نے یہ استدلال کیا کہ استعمار کے معاشی فوائد کسی قدر منتخب گروہ کو حاصل ہوتے ہیں، پوری قوم ان سے محروم ہی رہتی ہے۔ مارکسوادی استعمار کی تشریح سرمایہ داری کی اگلی سیڑھی سے کرتے ہیں جب کہ قومی سرمایۂ معیشت پر اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے اور ضرورت از زائد پیداوار کی کھپت کے لیے سرمایہ دار ملکوں میں مسابقت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ نقطہ نظر ہے ولادیمیر لینن (۱۸۷۰-۱۹۲۴ء) اور این آئی نجارن (۱۸۸۸-۱۹۳۸ء) کا جو سرمایہ داری اور استعمار کو یکساں درجے میں رکھتے ہیں۔ محققین اور تجزیہ کار اس نقطۂ نظر کی سب سے بڑی کمزوری یہ بتاتے ہیں کہ تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں ہے اور اس فکر سے سرمایہ داری سے قبل پائے جانے والے استعمار کی تشریح نہیں ہوتی۔نہ اشتراکی استعمار کی اس سے تفہیم کی جا سکتی ہے۔

دوسرا گروہ مفکرین اور تجزیہ کاروں کا وہ ہے جو استعمار کو انسانوں، انسانی جماعتوں اور ریاست کے مزاج اور فطرت سے مربوط کر کے دیکھتا ہے۔ مکیاویلی (۱۴۶۹-۱۵۲۷ء)، سر فرانسیس بیکن (۱۶۲۶-۱۵۶۱ء)، لدوگ گمپووچ (۱۸۳۸-۱۹۰۹ء) ایڈولف ہٹلر (۱۸۸۹-۱۹۴۵ء) اور بنیٹو مسولینی (۱۸۸۳-۱۸۴۵ء) وغیرہ وہ دانشور اور سیاست داں ہیں جنھوں نے استعمار کے مختلف زاویوں، عوامل اور محرکات سے بحث کی ہے مگر ان سب کا نتیجہ بحث مشترک ہے۔ وہ یہ کہ استعمار دراصل بقا کی فطری جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔جن لوگوں کو برتر خصوصیات و اقتدار

عطا ہوئی ہیں وہ فطری طور پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔

بحث کا تیسرا زاویہ تحفظ اور دفاع سے متعلق ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق قوموں میں یہ داعیہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بنیاد بنائیں، دفاعی ہتھیار رکھیں۔ ماتحت سلطنتوں کی فہرست تیار کریں، فطری سرحدوں پر نگاہ رکھیں، ابلاغیات اور ترسیلات کو قابو میں کریں تا کہ وہ اپنا دفاع کر سکیں اور دوسروں کو ان وسائل سے محروم رکھیں۔ جو مفکر اور دانشور ریاستوں کے اس حق کا انکار کرتے ہیں ان کا استدلال ہے کہ تحفظ حاصل نہیں ہوا ہے۔ ایک ریاست کی دوسری ریاستوں پر توسیع اور ان کے انسانوں پر تسلط جمانے کے عمل سے گروہ بندی اور عدم تحفظ کو بڑھاوا ملتا ہے کیوں کہ اس طرح کی استعماری ریاستوں کے مابین آگے چل کر محاذ آرائی ناگزیر ہو جاتی ہے۔

بحث کا چوتھا زاویہ اخلاقیات اور مذہبیات کا ہے۔ بسا اوقات استعمار کے ساتھ مشنری جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ بعض قوموں کو غرّہ ہو جاتا ہے کہ وہ دوسری قوموں کو آزادی دلائیں گی استبداد و آمریت سے۔ انہیں برتر زندگی اور اعلیٰ تر اقدار کی نوازشوں سے ہمکنار کریں گی۔ انہیں ناز ہوتا ہے اپنی تہذیب اور طرز زندگی پر اور وہ قوت و طاقت سے دوسری قوموں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان کی تہذیب اور ثقافت کو اپنا لیں۔ اسی مفہوم میں مغرب کاری اور یوروپ کاری کی اصطلاحات مستعمل ہیں۔

استعمار بمقابلۂ عالم اسلام

مغرب نے ہمیشہ استعماری ذہنیت، فکر اور پالیسی اپنائی۔ عالم اسلام پر بتدریج اپنا تسلط قائم کیا۔ انیسویں صدی میں مسلم دنیا کی پسپائی کا عمل شروع ہوا۔ انگریزوں نے ہندوستان، برما اور ملیشیا پر اپنے پنجے گاڑ دیے۔ ہالینڈ نے انڈونیشیا کو اپنی نو آبادی بنایا۔ روسیوں نے قفقاز اور ترکستان کو تاخت و تاراج کیا۔ برطانوی استعمار نے ہندوستان سے پھیل کر عدن اور خلیج فارس تک اپنی سلطنت کی توسیع کی۔ تین مختلف مرحلوں میں برطانوی فوجی دستے افغانستان پر حملہ آور ہوئے جب کہ روس نے مختلف موقعوں پر شمالی ایران کے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کیا۔ اگر یہ دونوں ممالک

اپنی نام نہاد آزادی برقرار رکھ سکے تو اس کی حیثیت روسی اور برطانوی توسیع پسندانہ عزائم کے درمیان ایک ''بفرزون'' کی رہی۔ ۱۹۰۷ء میں ایک خفیہ معاہدے کے تحت ایران میں دونوں استعماری طاقتوں کے دائرۂ اثر کی تحدید ہوئی اور افغانستان میں برطانوی مفادات کو تسلیم کرلیا گیا۔

افریقہ میں ۱۸۳۰ء میں فرانس نے الجزائر پر اپنا غلبہ قائم کرلیا اور وہاں سے اس کی توسیع پسندی بتدریج بحر اٹلانٹک کے ساحلی علاقوں سے گزرتے ہوئے وسطی صحارٰی کے تمام خطوں اور استوائی و مغربی افریقہ کے مسلم علاقوں پر قابض ہوتی گئی۔ شمالی نائیجیریا کی امارتیں بھی برطانوی تحفظ کے سایہ میں آنے سے نہ بچ سکیں۔ ۱۸۸۱ء میں فرانس نے تیونس پر اپنا قبضہ جمایا۔ برطانیہ نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر تسلط قائم کیا اور نویں دہائی میں دریائے نیل سے گزر کر سوڈان تک جا پہنچا اور مہدی سوڈانی کی تحریک اور سلطنت کو کچل کر رکھ دیا۔ اسپین نے مراکش اور مغربی صحارٰی میں اپنی توسیعی مہم چلائی مگر مراکش کے مرکزی علاقے فرانس کے تسلط میں آئے جو ۱۹۱۲ء میں اس کے زیر انتداب چلے گئے۔

عالم اسلام کے جنوبی حاشیوں پر دوسری استعماری طاقتوں نے اپنا ڈیرا ڈالا۔ جرمنی نے کیمرون اور تنزانیہ کو اپنے چنگل میں پھنسایا۔ بلجیم کے شاہ لیوپولڈ نے کانگو میں اپنی شاہانہ ریاست قائم کرلی جب کہ برطانیہ نے زنجبار، کینیا اور یوگنڈا کو اپنا نشانہ بنایا۔ اٹلی نے اریٹریا پر تغلب قائم کر کے صومالیہ کے خطوں کو اپنے اور برطانیہ کے درمیان بانٹ لیا جب کہ فرانس نے بحر احمر کے دہانے پر واقع جیبوتی بندرگاہ پر اپنے پنجے گاڑ دیے۔ صورت حال یہ ہوگئی کہ ایتھوپیا کی عیسائی حکومت تک مغرب کی توسیع پسندی کی سازش میں شریک ہوگئی۔ مگر ۱۹۳۶ء میں اسے بھی اطالوی استعمار کا نشانہ بننا پڑا، اس سے پہلے اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں لیبیا کو ہڑپ لیا تھا۔

الجزائر، مصر، تیونس، لیبیا، سوڈان یہ سارے مسلم ممالک خلافت عثمانیہ کے صوبے تھے جو بتدریج مسلمانوں کے اثر سے نکلتے گئے۔ دوسری طرف عیسائی ریاستیں جن پر عثمانیوں کا اب تک دبدبہ باقی تھا۔ جیسے مونٹی نیگرو، بے سربیا، سربیا یونان، رومانیا، بوسنیا، بلغاریہ، مقدونیہ، البانیہ اور

مغربی تھریس دھیرے دھیرے آزاد ہو گئے۔ خلافت کے ایشیائی ملکوں میں عیسائی اقلیتوں کو خصوصی درجہ دینے کی مانگ بڑھی اور جب پہلی جنگ عظیم بند ہوئی تو عثمانی سلطنت کے حصے بخرے ہو چکے تھے۔ وہ عرب حکومتیں جو آزادی کے سحر میں گرفتار ہو کر خلافت کے خلاف بغاوت میں شریک ہوئی تھیں اب پراگندہ فکری اور سخت ذہنی کرب سے دوچار تھیں۔ اب انہیں ادراک ہوا کہ آزادی کا خواب سراب تھا اور برطانیہ اور فرانس نے عرب مشرق وسطیٰ کے بندر بانٹ میں بدترین بدعہدی اور سیاسی خیانت کا ثبوت دیا تھا۔ برطانیہ نے عراق، فلسطین اور شرق اردن کو اپنے دائرہ اثر میں داخل کیا اور فرانس نے لبنان اور شام پر اپنی چودھراہٹ قائم کی۔ استعمار کی سازشیں بڑھیں، اس کی نوآبادیاتی حرص میں اضافہ ہوا۔ عالم اسلام کی بچی کھچی بیمار خلافت کا وجود بھی اسے ناگوار گزر رہا تھا چنانچہ ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال پاشا کے ہاتھوں خلافت کا نظام ختم کر دیا گیا اور جمہوریت، قوم پرستی، عوام پسندی، قومی ملکیت، سیکولرزم اور انقلابیت کے چھ نام نہاد اہداف کے حصول کے لیے اسے ایک قومی جمہوریہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ عالم اسلام کے خلاف مغربی استعمار کی طویل تاریخ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے مندرجہ ذیل اقدامات کیے:

سیاسی تغلّب

مغربی استعمار پہلے تاجر اور مبلّغ کی حیثیت میں مسلم علاقوں میں داخل ہوا پھر بتدریج اس نے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر یلغار کر دی۔ ایک بلند تر تہذیب کے پیامبر کے روپ میں۔ آخری مرحلے میں مغربی استعماری طاقتوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں اور مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ مغربی تہذیب کے سائے میں اور مغربی فوجوں کے تحفظ میں مغربی حکمرانوں کی سرپرستی میں زندگی گزاریں۔ اس سیاسی تغلب سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ آرنلڈ ٹائن بی نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ "مغرب اور باقی دنیا میں پچھلے چار پانچ سو برسوں سے کشمکش برپا ہے۔ اس کشمکش میں مغرب نہیں بلکہ دنیا نقصان اٹھا رہی ہے اور اسے مستقل تجربات ہو رہے ہیں، اپنی

محرومیوں کے۔ مغرب کا آج تک کوئی نقصان نہیں ہوا ہے بلکہ نقصان برابر مغرب سے ہو رہا ہے۔ مغرب آج موجودہ صدیوں میں سب سے بڑی ظالم قوت کے روپ میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔"[۱]

معاشی استحصال

مغرب نے پورے مشرق کا معاشی استحصال کیا، مگر مسلمان اس کا سب سے زیادہ نشانہ بنے کیوں کہ مشرق میں زیادہ تر مسلمانوں سے ہی اس نے اقتدار چھینا تھا۔ یہ مغرب کی سوچی سمجھی پالیسی تھی کہ ان ممالک میں مسلمانوں کو اقتصادی اور سماجی طور پر حاشیے پر پہنچا دیا جائے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی مشہور زمانہ کتاب دی انڈین مسلمان میں تسلیم کیا ہے کہ 'ایسا نہیں تھا کہ مسلمان ہندوؤں سے کم تر تھے۔ یہ تو حکومت برطانیہ کا نظر کرم تھا، جس نے مسلمانوں کو حاشیے پر پہنچایا[۲] "درحقیقت کلکتہ میں شاید ہی کوئی دفتر حکومت کا ہوگا جس میں مسلمان کسی منشی، پہریدار، چپراسی سے بڑے عہدے کی امید رکھتا ہو۔' اور 'ایک سو ستر سال پہلے بنگال میں ایک پیدائشی مسلمان کے لیے غریب ہونا بڑا مشکل کام تھا، اب ان کے لیے خوشحال رہنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔"[۳]

مسلمانوں کا یہ معاشی استحصال ہندوستان تک محدود نہ تھا پورے عالم اسلام میں استعماری قوتوں کی یہی حکمت عملی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی معاشیات کو مستحکم نہ ہونے دیا۔ اپنی تاجرانہ سیاست سے وہاں کے اقتصادی وسائل پر قابض ہوئیں اور معاشی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا۔ اس استحصال نے مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی مغرب کے خلاف نفرت کو دوآتشہ کیا۔

مغربی نظامِ تعلیم کی ترویج

مغربی نوآبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کی خاطر مسلمان ملکوں میں ایک ایسا نظام تعلیم رائج کیا گیا جو استعماری اغراض و مقاصد کی تکمیل میں مدد و معاون بن سکے۔ لارڈ میکالے نے صاف لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ "ہمیں ایک ایسی جماعت کی تشکیل کے لیے انتھک کوشش کرنی ہے جو ہمارے اور لاکھوں محکوم انسانوں کے درمیان ترجمانی کا کام کر سکے، ایسے لوگوں کی جماعت جو

اپنے رنگ اور خون میں تو ہندوستانی ہوں مگر اپنے ذوق اور مزاج میں، رائے اور فکر میں، دماغ اور اخلاقیات میں انگریز ہوں۔''

اس تعلیمی نظام نے دانشوروں، تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کی جو عالم اسلام میں مغرب کاری کی ہراول دستہ ثابت ہوئی۔ یہ نظام تعلیم مسلمانوں میں نئی سوچ، نئی فکر و تحقیق پیدا کرنے میں کامیاب ضرور ہوا مگر مسلمانوں کی تہذیبی وراثت، ان کے افکار و عقائد اور رجحانات تاریخ سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے فکری انتشار اور بیشتر اوقات تہذیبی تصادم پر منتج ہوا۔ روایتی علماء نے اس پورے نظام کی زبردست مخالفت کی اور اسے اسلام کے خلاف سازش سے تعبیر کیا۔ اقبالؒ نے ہندوستان میں اس کی بھرپور مخالفت کی ع

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اکبر الٰہ آبادیؒ نے اس پر بھرپور وار کیا ع

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

تعلیم نسواں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ع

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ

سید مودودیؒ نے جدید درس گاہوں کو قتل گاہ قرار دیا، جہاں مسلمان طلبہ کی فکر، تہذیب اور عقیدہ کا خون کیا جاتا ہے۔ مولانا قاسم نانوتویؒ اور تمام علماء نے اس نظام تعلیم کے خلاف اقدامی کارروائیاں کیں اور اپنے نظام تعلیم اور فکر و عقیدہ کے تحفظ کے لیے دینی درس گاہیں قائم کیں۔ ہندوستان میں سر سید احمد خاں، مصر میں رفاعہ طہطاوی، تیونس میں خیر الدین پاشا نے جدید نظام تعلیم کی حمایت کی اور اس کے مثبت اور تعمیری پہلوؤں سے استفادہ کرنے پر زور دیا۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی

تصنیف ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ ''عوامی تعلیم کا ہمارا نظام روایات کا مخالف، مذہب کے تقاضوں کے غیر مناسب حال اور ان سے متنفر اور مسلمانوں کی تہذیب سے متصادم ہے، اس لیے اس میں کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی ایک ایسے نظام سے الگ تھلگ رہے جو اُن کے تعصّبات کو رعایت دینے کے لیے آمادہ نہ تھا، جس نے اُن ضروریات کو ملحوظ نہ رکھا، جنہیں مسلمان اپنے لیے ناگزیر تصور کرتے تھے اور جو لازمی طور سے ان کے مفادات و حاصلات کا مخالف اور ان کی سماجی روایات و اقدار سے یکسر مختلف تھا۔''[۴]

تہذیبی غلبہ

استعماری طاقتوں نے پوری کوشش کی اور اس کے لیے اپنے تمام وسائل صرف کر دیے کہ عوام اپنی تہذیبی جڑوں سے کٹ جائیں اور مغربی ثقافت کو اختیار کر لیں، مغربی طرز حیات، مغربی تمدن کو رائج اور مقبول بنانے کے لیے مسلم ممالک میں تہذیبی و ثقافتی مہم چلائی گئی۔ اشرافیہ جو مغرب کی نقالی کرے، اس کی ہمت افزائی کی گئی۔ یوروپ کے مختلف ملکوں میں انہیں تعلیم حاصل کرنے اور وہاں کے رنگ میں رنگ جانے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ سفارتی تعلیمی و ثقافتی تبادلے کی تحریکیں چلائی گئیں۔ عرب دنیا میں بطور خاص آزادیٔ نسواں کے حامی مفکرین، دانشوروں اور صحافیوں کو اعزازات سے نوازا گیا۔ حجاب کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کیا گیا اور اسے فرسودہ، ترقی کے لیے سدّ راہ ثابت کیا گیا۔ خواتین اسلام کو دعوت دی گئی کہ وہ تمام بندشیں توڑ دیں اور مذہب و معاشرے کی زنجیروں سے آزاد ہو جائیں۔ علمی دنیا میں مسلمانوں کو ''روایت پسند'' اور ''ترقی پسند'' دو جماعتوں میں تقسیم کر کے ان کے درمیان تفریق و تصادم کو ہوا دی گئی۔ اول الذکر کو ظلمت پسند، ترقی مخالف، سائنس دشمن، حقوق نسواں سے متنفر، جمہوریت و آزادی کا باغی قرار دے دیا گیا، جو مذہبی جنونی، رجعت پسند اور انسانیت متصادم ہے جب کہ دوسرے گروپ کو ترقی، آزادی، حقوق انسانی اور جمہوریت کا علمبردار بتایا گیا اور کوشش کی گئی کہ ان

دونوں عناصر کے درمیان کوئی قربت یا تفاہم پرورش نہ پائے۔ مسلمانوں میں علی عبدالرازق، طٰہٰ حسین، قاسم امین جیسے لوگوں کو وسائل فراہم کیے گئے تاکہ وہ مغرب کے مضبوط نقیب بن کر ابھریں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دریدہ وہنی کرنے والے عناصر کو مغربی میڈیا نے ادب، علم اور جمہوریت کا پاسبان بنا کر پیش کیا۔ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے لوگوں کی بڑی حمایت اور تائید کی گئی اور شیریں عبادا اور نجیب محفوظ کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اس سے مسلمانوں میں مغرب سے نفرت بڑھتی گئی اور بتدریج تہذیبی تصادم کے لیے راہ ہموار ہوتی گئی۔

عیسائیت کا فروغ

استعماری طاقتوں نے اپنے اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے عیسائی مشنریوں کی فوج تیار کی اور انہیں مسلم ملکوں پر مسلط کیا کہ وہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کریں، اپنے اسکولوں کے ذریعے عوامی خدمت کے اداروں کی معرفت عوام کا دل جیتیں اور انہیں عیسائی بنائیں۔ اکبرالہٰ آبادی نے اس پوری مہم پر بڑا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے ؏

توپ کھسکی، پروفیسر پہنچے
جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے دوش بدوش عیسائیت نے بڑا فروغ حاصل کیا اور ہر ممکن صورت سے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی گئی۔ برٹش کمپنی کی تائید واعانت سے ملک کے طول وعرض میں مسیحی تبلیغ و تنظیم کے ادارے قائم کیے گئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تو اس سلسلے کو بڑی وسعت دی گئی کہ انقلاب ناکام ہو چکا تھا، علماء و تحریک آزادی کے رہنما تختہ دار پر لٹکا دیے گئے تھے اور ہر سو خوف و ہراس کا عالم تھا اور مشنری اداروں کو برطانوی سنگینوں کا بھرپور تحفظ حاصل تھا۔ چنانچہ عیسائی پادریوں نے کھلے عام بازاروں، میلوں اور عام مجمعوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراضات کیے اور دھونس دھاندلی سے مذہبی مناظرے قائم کیے اور انہیں جیتنے

کی ہر ممکن کوشش کی ۔ انگریزوں نے ہندوؤں کو معاشی طور سے مستحکم کیا، سیاسی میدان میں انہیں آگے بڑھایا اور پھر مسلمان علماء سے ان کے مناظرے کرائے اور اس کی سرپرستی کی کہ ہندو مسلمانوں سے کھلے عام مناظرے کریں اور مذہبی موضوعات پر انہیں دعوتِ مبارزت دیں۔

فتنۂ استشراق

مغرب کی استعماری طاقتوں نے سیاسی و عسکری محاذوں کے ساتھ علمی وفکری محاذوں پر بھی مورچہ بندی کی اور ایسے علماء اور مغربی دانشوروں کی کھیپ تیار کی جو مشرقی زبانوں پر عبور حاصل کریں، مآخذ و مصادر کا گہرائی سے مطالعہ کریں، کلاسیکی کتب کی ترتیب و تدوین کریں، قرآن و سیرت اور دوسرے علومِ اسلامی میں درک حاصل کر کے ان پر اپنی علمی نگارشات پیش کریں مگر مقصد رہے استعماری مقاصد کا حصول۔

چنانچہ علومِ اسلامیہ کے میدان میں ایک نئے فن ''استشراق'' کا ظہور ہوا اور اس فن کے ماہر مستشرق کہلائے۔ بحیثیت مجموعی مستشرقین کا اسلوب، فکر اور تحقیق استعماری رہا۔ انہوں نے اسلامی تہذیب اور علومِ اسلامی کے ہزار سالہ ورثے کے تئیں تجاہل، تعصب اور دشنام طرازی کا رویہ اپنایا۔ جن لوگوں نے کچھ معروضیت برتنے کا مظاہرہ کیا، انہوں نے بھی محمد ﷺ پر لکھتے وقت علمی دیانت اور تحقیقی غیر جانبداری سے کام نہ لیا اور آپ ﷺ کی نبوی حیثیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ قرونِ متوسطہ کی صلیبی ذہنیت مجموعی طور پر ان کی تحریروں پر حاوی رہی۔ چنانچہ مسلم دنیا میں فتنۂ استشراق کی تباہ کاریاں ایک مختصر مدت کے لیے ہی جاری رہ سکیں۔ علمائے مجددین نے اس کا سخت نوٹس لیا، اس کی گمراہیوں سے عوام کو آگاہ کیا اور اس کے جواب میں متکلمین اسلام نے ایک وسیع اور جاندار لٹریچر تیار کیا، جس سے ایمان و یقین کو آگہی حاصل ہوتی ہے اور اسلام کے لیے وفاداری اور جاں نثاری کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ Toynbee. Arnold J., The World and the West. pp. 1-4

۲۔ Hunter, Sir. W.W.. The Indian Mussalmans, 1969, Delhi. Reprinted from the third edition, p. 162

۳۔ نفس مصدر، ص ۱۵۰

۴۔ نفس مصدر، ص ۱۵

☆☆☆

سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام

مشرق و مغرب کی کشمکش

عصری دنیا اختلافات و تضادات کی حامل ہے، یہ دو سماجی نظاموں، سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم کے درمیان جاری کشمکش کی عکاسی کرتی ہے، ان دونوں نظاموں کے درمیان جاری کشمکش جو مختلف میدانوں، سیاست، معیشت اور حضارت وثقافت کا احاطہ کرتی ہے لوگوں کی نگاہوں کے عین سامنے ہو رہی ہے، جہاں لوگ جمہوریت اور ترقی کی ایک مختصر اور موزوں راہ کی تلاش میں ہیں، وہ سامراجی ریاستوں اور سوشلسٹ ممالک میں رونما ہونے والے واقعات کا قریب سے مشاہدہ کر رہے ہیں، حقائق اس بات کا مظہر ہیں کہ تمام ممالک اپنے تمام بلند آہنگ دعووں کے ساتھ ایک گہرے درد و کرب میں مبتلا ہیں۔ عملاً بے لگام حکومتوں نے بے پناہ سیاسی و معاشی طاقت حاصل کر لی ہے اور مزید حاصل کرنے کی ہوس میں مبتلا ہیں، اجارہ داریاں زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی دھن میں پوری ریاستی مشینری کی سرگرمیوں میں کھلے عام مداخلت کرتی ہیں، نمائندہ ادارے پارلیمنٹ اور میونسپل کونسلیں اپنے سابقہ اختیارات سے محروم ہو رہے ہیں، کرپشن، دفتر شاہی، افراد کی نگرانی اور پولیس کے جبر و دباؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، بے روزگاری بھی بڑھ رہی ہے، دولت اور غربت کے درمیان کی خلیج اور وسیع ہوتی جا رہی ہے اور جرائم پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئے ہیں، سرمایہ دارانہ ممالک کو ماحول کی آلودگی کے سنگین خطرے کا سامنا ہے، سامراجی دنیا میں طبقاتی قومی اور نسلی تضادات میں کافی شدت پیدا ہو چکی ہے صنعتی ہڑتالوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نیگرو مسئلہ ہنوز حل طلب ہے، فرانسیسی زبان بولنے والی آبادی پر مشتمل کیوبک کے مسئلے نے کناڈا کے وفاق کو انتشار کی دہلیز تک پہنچا دیا ہے، بلجیم میں فلیمنگوں اور دالونوں کے درمیان نزاع جاری ہے،

السٹر میں خون بہایا جا رہا ہے اور اٹلی میں فاشسٹوں کے گروہ لوٹ مار اور ہنگامہ برپا کر رہے ہیں، دوسری طرف اشتراکی ممالک ہیں جو سامراجی ریاستوں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہیں، دراصل دونوں کی تہذیبوں میں کوئی ادنی سا فرق نظر نہیں آتا، مذہب بےزاری، پیدائش دولت کے لیے اندھا جنون، کمزوروں کے حقوق پر ڈاکے بین الاقوامی تعلقات میں بےاصولی دونوں کی نمایاں خصوصیتیں ہیں، امریکہ جب اپنے مفادات پر کوئی آنچ آتے دیکھتا ہے تو کوریا اور ویت نام میں انسانی خونوں سے ہولی کھیلنے لگتا ہے اور جب اشتراکیت پرست حضرات قہر وغضب میں ہوتے ہیں تو وہ ہنگری، چیکوسلواکیہ اور افغانستان کو اپنے قہر وغضب کا نشانہ بناتے ہیں، ایسا کیوں ہے، ہمیں کہیں بھی سکون واطمینان حاصل نہیں ہوتا، آج کسی پر اعتبار کرنا سخت حماقت ہے دنیا کے تمام ممالک رہزن، قاتل اور لٹیرے ہی کیوں نکلے؟

ان سوالات پر غور کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل سوالات پر غور کرنا اور ان کا حل طلب کرنا ہوگا اس لیے کہ اول الذکر سوالات کے جوابات آخر الذکر کے جوابات پر منحصر ہیں:

۱۔ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

۲۔ اس کائنات میں انسان کی پوزیشن اور اس کا نصب العین کیا ہے؟

۳۔ انسانیت کے دکھوں کا درماں کہاں ہے؟

آیئے سب سے پہلے سوال اول پر غور کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ آخر الذکر دونوں سوالوں کے جوابات پہلے سوال کے جواب میں پوشیدہ ہیں۔

جہانی نظریہ

فلسفیوں کا ایک طبقہ کائنات کے وجود کا ہی قائل نہیں ہے، اس کے نزدیک ہم جو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں، اس کی حیثیت ایک واہمہ، خیال یا خواب سے زیادہ نہیں، کائنات اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی، یہ محض اوہام کی پیداوار ہے، ان کے خیال میں کائنات کوئی چیز نہیں جس کے اندر

کوئی دماغ سوچ رہا ہے بلکہ دماغ ایک چیز ہے جس کے اندر کائنات رہتی ہے۔ برکلے کا خیال ہے کہ:

"Material bodies are only ideas. Their existence consists in the being perceived by true mind. The existence of extra mental bodies is only a dogmatic and superfluous assumption. Instead of supposing that the mind is in the world we should suppose that the world is in the mind."[1]

"مادی اجسام صرف خیالات ہیں، ان کا وجود کسی ذہن کی نگاہوں کا مرہونِ منت ہے، اذہان سے باہر کسی چیز کے وجود کا تصور ایک بے دلیل اور سطحی مفروضہ ہے، ہم لوگوں کو یہ فرض نہیں کرنا چاہیے کہ دماغ کسی دنیا کے اندر ہے بلکہ اس کے برعکس ہمیں یہ فرض کرنا چاہیے کہ دنیا ہی دماغ کے اندر ہے۔"

وہ فلاسفہ جو کائنات کے وجود کے ہی قائل نہیں ان کے نزدیک انسان کا وجود ایک بے معنی چیز ہے، چہ جائیکہ اس کے مقصد اور نصب العین کی تعیین ہو۔

فلسفیوں کا ایک دوسرا گروہ کائنات کے وجود کو تو مانتا ہے، لیکن وہ کسی موجد کو تسلیم نہیں کرتا۔ مادیت کے ایک ممتاز علمبردار پروفیسر ٹنڈل (Tyndall) نے یہاں تک لکھا ہے:

"مادہ میں ہر قسم کے وجود کے امکانات موجود ہیں۔" وہ کہتے ہیں:

"مادہ قابل تقسیم ہے، اس کو (Molecules) جوہروں اور (Atoms) ذروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یہ ذرے مختلف حجم اور مختلف وزن کے ہیں اور یہ مختلف عناصر کے سب سے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو ازلی اور قائم بالذات ہیں، نا قابل تقسیم اور آزاد ہیں جو فنا نہیں ہو سکتے اور جو فضائے بسیط میں بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے ہوئے ہیں، نیز

ان کے اتفاقی طور پر ملنے سے ہر چیز کی تشکیل ہوئی ہے، گویا سارا ہنگامۂ وجود ایک مجموعۂ ذرات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، ان ہی ذروں سے بے حد و حساب اجسام بنے، زندگی نے وجود پایا اور شعور ذہن کی تخلیق ہوئی۔" (سائنس اور ضابطۂ حیات)

لیکن اس نقطۂ نظر میں بہت سی دشواریاں پنہاں ہیں۔

اس نظریہ میں مفروضات کی فہرست بہت دراز ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک تو اس میں صرف نظریات ہی نظریات ہیں، ایک فلسفی کا قول ہے: It (materialism) assumes every thing and explains no thing. یہ ہر چیز کو فرض کر لیتا ہے لیکن تشریح کسی چیز کی نہیں کرتا۔

اس نظریہ کی دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ آخر اس کائنات میں ہماری زندگی کا آغاز کیسے ہوا، یہ نظریہ کہتا ہے کہ ایک جاندار شئے نے جسے حیاتیات کی اصطلاح میں Protoplasm کہتے ہیں خود کو چند طبعی و کیمیائی اثرات کے تحت متشکل کیا اور یہی جاندار شئے تمام جاندار اشیاء کے پیدا ہونے کا سبب بنا، یہی ایک خلیہ اپنے ماحول کی چند طبعی و کیمیائی عوامل کی کارفرمائیوں کی وجہ سے ارتقائی ادوار طے کرتا ہوا پیچیدہ سے پیچیدہ تر جانوروں کو جنم دیتا چلا گیا، حتی کہ اس دور کا سب سے آخری جانور انسان تھا، ان فلسفیوں کے نزدیک کسی بے جان شئے کا چند طبعی و کیمیاوی عمل کی کارفرمائیوں کی وجہ سے جاندار شئے میں تبدیل ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ جاندار اشیاء کے اجسام کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی یہی بے جان مادے ہیں مثلاً کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن وغیرہ۔

اور پانی، مٹی، ہوا، سردی اور گرمی جو بالکل بے جان مادے ہیں، مگر جب اکٹھا ہو کر مدتوں پڑے رہتے ہیں اور ان میں بساند پیدا ہو جاتی ہے تو کچھ دنوں کے بعد اس میں Bacteria جیسے جان دار کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔

لیکن حالیہ سائنس نے ان تمام مفروضات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ پہلی دلیل تو اس وجہ سے

غلط ہے کہ یہ تجربہ کا بالکل نصف حصہ ہے، اس لیے تجربہ کی تکمیل تو اس وقت ہوگی جبکہ تجزیائی اور ترکیبی دونوں طریقے اس کی تصدیق کریں، تجزیاتی طریقہ صرف اتنی معلومات فراہم کرتا ہے کہ فلاں مرکب میں فلاں فلاں عناصر پائے جاتے ہیں لیکن ترکیبی طریقہ ٹھیک اس کے ضد بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں چیز کے ترکیب پانے سے فلاں مرکب تیار ہوتا ہے، جاندار اجسام کا تجزیہ بتاتا ہے کہ اس کی ترکیب کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور دوسرے غیر نامیاتی مادوں سے ہوئی ہے، اب اگر ان غیر نامیاتی مادوں کو ملانے سے کوئی جاندار جسم تیار ہو جائے تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گی، مگر یہ معلوم ہے کہ سائنس اتنی کوششوں کے باوجود بے جان مادوں سے زندگی کی ابتدائی رمق بھی معلوم نہیں کرسکی ہے۔ دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ پاسچر (Pasteur)، لسٹر (Lister)، ٹنڈل (Tyndall) اور دوسرے بہت سے سائنسداں، متعدد تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ زندگی بے جان مادوں سے وجود میں نہیں آسکتی، زندگی کا ابھار کسی سابق زندگی ہی سے ہوسکتا ہے۔

تیسری دشواری یہ ہے کہ یہ نظریہ انسانی اجسام میں عقل وشعور کی کوئی معقول توجیہ نہیں کرتا، بقاد تحفظ توانائی کے اصول The Principle of Conservation of Energy کے مطابق ایک مادی توانائی کو دوسری مادی توانائی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، اس اصول کی بنا پر مادہ پرست کہتے ہیں کہ ذہنی توانائی جسم ودماغ کی توانائیوں کی تبدیل شدہ شکل ہے، مگر یہ توجیہ درست نہیں، اس لیے کہ اس اصول میں مادی توانائی کی شرط ہے اور ظاہر ہے کہ عقل وشعور اور فکر ونظر مادی توانائی سے ماوراء ہے، محض مادی توانائی سے عقل وشعور کی پیدائش اتنی بعید از فہم ہے کہ مادیت کے ایک ممتاز علمبردار پروفیسر ٹنڈل کو بھی تسلیم کرنا پڑا:

> ''مادی ساخت اور عقل وشعور کے واقعی مظاہر میں تطابق کی راہیں تلاش کرنا ناقابل تصور ہے۔ ان دو اقسام کے مظاہر میں دو خلیج حائل ہیں، وہ عقلی اعتبار سے ناقابل عبور ہی رہے گی۔''

ان مادی نظریات کی بنیاد پر جو فلسفہ نظام حیات و مرتب کیا گیا ہے وہ بھی اسی طرح ناقص، ادھورا اور غیر سائنٹفک تھا، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا ان نظریات سے اکتا چکی ہے، لیکن اس اکتاہٹ اور پریشانی کا مداوا کیا ہے۔ اسے جاننے اور اس پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں، ان مادہ پرست فلسفیوں نے انسان کا سب سے اہم مسئلہ معاش کا حصول بنا دیا اور انہوں نے کہا کہ انسان صرف ایک حیوان ہے، اسے روٹی، کپڑا اور مکان کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے اور انسان کا مقصد زیست بہتر سے بہتر معاشی زندگی کا حصول ہے، تہذیب و تمدن اور حضارت و ثقافت کا ارتقاء معاشی زندگی پر موقوف ہے، یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں انسان کے معاشی اور روحانی مسائل کے حل کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں، آیئے علی سبیل الانفراد ہر ایک کا جائزہ لیا جائے کیوں کہ آج دنیا کی فکری امامت اور عملی تدبیر دونوں ہی کا سررشتہ ان ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

سرمایہ داری کے اصول

جدید نظام سرمایہ داری (Modern Capitalism) کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:

۱۔ سب سے اہم اصول جس پر اس نظریہ کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے یہ ہے کہ افراد صرف ان ہی چیزوں کے مالک نہیں ہیں، جو ان کی روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتی ہیں بلکہ ان چیزوں کے مالک بھی ہوں گے جو ذرائع پیداوار میں آتی ہیں۔

۲۔ ہر شخص کو سعی و جہد کا موقع ملنا چاہیے، کوئی ان کی کوششوں پر قدغن نہیں لگا سکتا، حتی کہ حکومت بھی۔ بائع اور مشتری کے معاملات انہیں کی مرضی پر موقوف ہونے چاہئیں۔

۳۔ سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ پیداواری قوت بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ انسانی حرص و طمع جو فطری ہیں انہیں ابھرنے کا موقع دیا جائے، اس طرح ہر شخص خود بخود بہتر سے بہتر کام کرنے کی کوشش کرے گا اور اس طرح چیزوں کی پیدائش میں اضافہ ہوگا۔

۴۔ مارکیٹ میں تاجروں کو مقابلہ کی آزادی ہی بے قید معیشت میں افراد کو خود غرضی کی بے جا حد تک بڑھنے سے روکتی ہے اور ان کے درمیان اعتدال وتوازن قائم کرتی ہے، کھلی مارکیٹ میں جب ایک ہی چیز کے بہت سے صنعت کار اور خریدنے والے موجود ہوں گے تو وہ مسابقت کی لالچ میں کسر وانکسار سے خود ہی قیمتوں کا ایک مناسب معیار قائم کرلیں گے۔

۵۔ ارتقاء کے فطری اسباب پر ان کو مکمل اعتماد ہے اور یہ کہتے ہیں کہ جب کاروبار میں منافع کا سارا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ لاگت کم اور پیداوار زیادہ ہو تو کاروباری آدمی کو اس کا مفاد اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ پیداوار بڑھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ سائنٹفک طریقے اختیار کرے۔

سرمایہ داری کی خرابیاں

لارڈ کینز نے بالکل سچ کہا ہے کہ:

> ''دنیا پر اخلاقی وفطری قوانین کی ایسی مضبوط حکومت قائم نہیں ہے جس کے زور سے افراد کے ذاتی مفاد اور سوسائٹی کے اجتماعی مفاد میں ضرور آپ ہی آپ موافقت ہوتی رہے، معاشیات کے اصولوں سے یہ استنباط کوئی صحیح استنباط نہیں ہے کہ روشن خیال خودغرضی ہمیشہ اجتماعی فلاح و بہبودی کے لیے کوشش کرتی ہے اور یہ کہنا بھی درست نہیں خودغرضی ہمیشہ روشن خیال ہی ہوا کرتی ہے، اکثر تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ انفرادی طور پر اپنی اغراض کے لیے جدوجہد کرتے ہیں وہ اس قدر ناداں اور کمزور ہوتے ہیں کہ خود اپنی اغراض کو بھی پورا نہیں کرسکتے کجا کہ ان کے ہاتھوں اجتماعی مفاد کی خدمت ضرور اور ہمیشہ انجام پاتی رہے۔''

اس طرح ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہ تھا کہ افراد کے حقوق پر کسی قسم کی آزادی نہ ہونی چاہیے، اس لیے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ چند مٹھیوں میں ملک کی ساری دولت آجاتی ہے اور غریب

عوام خستہ حالی کا شکار ہو جاتے ہیں، جس سے پوری سوسائٹی کی صحت، اخلاق اور تہذیب وتمدن پر برا اثر پڑتا ہے اور جب چند سرمایہ دار ملک کی ساری دولت پر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتے ہیں تو مزدوروں کی زندگی تنگی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور وہ غربت کی زندگی سہتے سہتے ایکدن سرمایہ دار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور دونوں میں غیر متناہی کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور معاشرہ دو طبقوں سرمایہ دار اور مزدور میں بٹ جاتا ہے۔

اس اصول میں ہمدری، محبت، تعاون اور تعامل جیسے صالح اور پاکیزہ جذبات معدوم نظر آتے ہیں، اس کے برعکس خودغرضی، حرص وطمع، باہمی تنافر کو جلا دیتی ہے، اعزہ واقربا، دوست و احباب اور استاد وشاگرد ایک دوسرے کی ہمدردی، سوز والفت اور رافت وشفقت سے محروم ہو جاتے ہیں اور اسی طرح سے دوسری بہت سی ناقابل علاج بیماریاں موجود ہیں۔

اگرچہ قدیم سرمایہ داری نظام میں بہت سی اصلاحات وترمیمات کی گئیں لیکن اس کے باوجود اس کے بنیادی عیوب جوں کے توں موجود ہیں، ڈکشنری میں امریکن پالٹکس میں ابوجین میکارتھی نے جمہوریت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

> ''یہ سماجی اور سیاسی تنظیم کا ایک فلسفہ ہے جو افراد کو زیادہ سے زیادہ آزادی اور ذمہ داری عطا کرتا ہے، عام طور پر جمہوریت کو ایسے ادارے درکار ہوتے ہیں جن کے توسط سے افراد کو کم سے کم وقفہ سے، لیڈروں اور سیاسی پالیسی اور پروگراموں کے معاملہ میں انتخاب کا موقع ملتا ہے۔''

یہ تو وہ چیز ہے جو الفاظ کے جامہ میں ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی سرمایہ دار ملک اور خصوصاً سب سے بڑھ کر امریکہ ووٹروں کو اپنے نمائندوں کے حقیقی انتخاب کا کوموقع نہیں دیتا، کیوں کہ اول تو ووٹر سے کئی برسوں میں صرف ایک بار رابطہ قائم کیا جاتا ہے اور اس وقت بھی وہ ایسے امیدواروں کو ووٹ دیتا ہے جنہیں خود اس نے نامزد نہیں کیا، دوسرے امیدواروں کے پیش کیے ہوئے سیاسی پروگرام، پروپیگنڈہ اور محض پروپیگنڈہ سے

لبریز ہوتے ہیں، اصل سرکاری کام حکومت کے ان اداروں میں ہوتا ہے جن میں انفرادی طور پرووٹر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ امریکی فوجیں ویتنام بھیجنے کا فیصلہ، امریکی عوام میں لائے بغیر کیا گیا اور اس فیصلہ میں ان کا کوئی دخل نہیں تھا، حالانکہ ابوجین مکارتھی کے فارمولے کے مطابق ووٹر نے اپنا حق انتخاب استعمال کیا تھا، پنٹاگن فوجی مہمات اور اسلحہ پر بھاری رقومات خرچ کرتا ہے جبکہ سابق وزیر انصاف ریمزے کلارک کے موجب ۴ر کروڑ امریکی افلاس اور اس کی لائی ہوئی لعنتوں یعنی بیماری، ناخواندگی، بیکاری، غلاظت اور مایوسی کے ماحول میں رہ رہے ہیں...... جہاں مکانات پرانے، گندے اور خطرناک ہیں، جہاں عوام قطعی طور سے حقوق سے محروم ہیں۔

(سوویٹ جائزہ بحوالہ ریمزے کلارک، امریکہ میں جرائم، ان کی نوعیت، اسباب، تدارک اور کنٹرول)

بورژوا جمہوری سیاسی اقتدار کے تحت، ریاستی اقتدار حکمراں طبقہ کی اکثریت کی ماضی کی عکاسی کرتا ہے، جسے مجموعی طور پر عوام کی مرضی کا نام دیا جاتا ہے، سرمایہ دار ممالک میں اس فریب کا چلن عام ہے، کیوں کہ انتخابی عمل میں بالغ آدمی کی اکثریت کی شرکت یہ تاثر پیدا کرتی ہے کہ بورژوا پارٹی جو الیکشن میں کامیاب ہوتی ہے، رائے دہندگان کی حیثیت سے حکومت بنانے کا فتویٰ حاصل کر چکی ہے، جمہوریت کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر اجارہ دار بورژوا فکر رفتہ رفتہ عوام کو جمہوریت میں جو کچھ بچا ہے اس سے محروم کرتی جارہی ہے یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی سیاسی زندگی میں انتخاب سے عوام بڑے بڑے پیمانے پر غیر حاضر رہتے ہیں، کروڑوں امریکی جو ووٹ دینے کے حق دار ہوتے ہیں، انتخابات میں حصہ نہیں لیتے، تقریباً چالیس فی صد رائے دہندگان صدارتی انتخابات کو نظر انداز کرتے ہیں اور اس سے بھی بڑی تعداد کانگریس کے انتخابات میں حصہ نہیں لیتی حتیٰ کہ فرانس میں بھی دو فیصد ووٹروں نے ۱۹۷۳ء کے انتخاب میں ووٹ نہیں دیا۔

اجارہ دار سرمایہ ریاستی اقتدار کے تمام کل پرزوں کو یا تو براہِ راست یا بالواسطہ کنٹرول کرتا ہے، یہ کاروباری انجمنوں صلاح کار کمیٹیوں اور دباؤ ڈالنے والے گروپوں کی طرح اداروں کا

ایک پورا نظام تشکیل دیتا ہے جو اجارہ داروں اور مختلف حکومتی اداروں کے درمیان مستقل رابطہ کا کام دیتے ہیں، انتہائی اہم حکومتی فیصلے کاروباری تنظیموں مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ایوان تجارت برطانوی صنعتوں کے کینفیڈریشن وغیرہ سے مشورہ کے بعد کیے جاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ سماج کے سارے امور کا انتظام وانصرام ایک پیشہ ور افسر شاہی کرتی ہے، جو ہر ریاست کے سیاسی نظام کا مستقل حصہ ہوتی ہے، پارلیمنٹوں اور حکومتوں میں پارٹیوں کے توازن میں تبدیلی کا اس پیشہ ور افسر شاہی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لینن نے کہا تھا کہ کسی سرمایہ دار ریاست میں ''وزراء کی تبدیلی کا کوئی خاص مفہوم نہیں ہوتا، کیوں کہ ایڈمنسٹریشن کا اصل کام افسروں کی ایک بہت بڑی فوج کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔''

عسکریت بندی نے یوں تو سبھی سامراجی ملکوں کو متاثر کیا ہے، لیکن اس کا خاص اثر ریاستہائے متحدہ امریکہ پر پڑا ہے، وفاقی حکومت ہر سال بجٹ کے ہر ایک ڈالر کا ستر فیصد ماضی، حال اور مستقبل کی جنگوں پر خرچ کرتی ہے۔ امریکی عوام نے فوجی مشین کی دیکھ بھال پر اس سے زیادہ رقم خرچ کرنے کی جتنی رقم وفاقی حکومت ریاستی قانون ساز اداروں اور میونسپلٹیوں کے ذریعہ صحت عامہ، ضعیف اور پنشن پانے والے لوگوں، سماجی تحفظ، بیروزگاری الاؤنسوں، مکانات کی تعمیر، عوامی جذبات اور زراعت کے لیے امداد پر خرچ کی گئی، امریکی عوام کے ذریعے ادا کیے گئے ٹیکسوں کی رقم کا محض گیارہ فیصد حصہ ہی غیر فوجی ضرورتوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

مغربی آئینی تھیوری کے مطابق پارلیمنٹ اور میونسپلٹیاں علی الترتیب قومی اور مقامی سطح پر عوام کی مرضی کا اظہار کرتی ہیں فی الواقع یہ رول انہوں نے کبھی بھی ادا نہیں کیا، تاہم صنعتی سرمایہ دارانہ نظام کے عہد میں ان اداروں کو تھوڑی بہت خودمختاری حاصل تھی، سامراجیت نے جس کی خاص خصوصیت سیاسی طاقت کا ارتکاز ہے، قومی اور مقامی نمائندہ اداروں کو خالصۃً صلاح کار اداروں میں بدل کر رکھ دیا ہے، قانون ساز اداروں مثلاً پارلیمنٹ کو جن کا بنیادی مقصد قانون

سازی ہی تھا اب قانون کی توثیق کرنے والی تنظیموں کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

سرمایہ دار ممالک میں سربراہ حکومت کو حقیقی آمرانہ اختیارات دئے جاتے ہیں، وہ نہ صرف یہ فیصلہ کرتا ہے کہ حکومت میں کون کون ہوگا بلکہ یہ بھی کہ ریاست کی اہم پالیسیاں کیا ہوں گی۔

انگریز ماہر سیاسیات، ایف، ڈبلو بینیمی نے اپنی کتاب 'منتخب بادشاہ' میں لکھا ہے "وزیر اعظم خود مختار ہوتا ہے یعنی وہ مکمل اختیارات کے ساتھ حکومت کرتا ہے، جبکہ تھیوری میں وہ پارلیمنٹ کے رحم وکرم پر ہوتا ہے، امریکی صدر کے ہاتھ میں مرتکز اختیارات بہت زیادہ ہیں۔ امریکی ماہر سیاسیات کلنٹن رازیر نے صدارتی اختیارات کے جائزے میں امریکی صدر کی ذمہ داریوں کو ان حیثیتوں میں گنایا گیا ہے: سرمایہ دار پرست، چوٹی کا انتظامی عہدیدار، قائد خارجہ پالیسی، قوم کی افواج کا سپریم کمانڈر، سب سے بڑا قانون ساز، پارٹی لیڈر، عوام کا واحد ترجمان، امن کا محافظ اور قوم کی خوش حالی کا منتظم اعلیٰ۔

یہ ہیں وہ خرابیاں جو جدید نظام سرمایہ داری میں ابھی باقی ہیں اور جو امریکہ، جرمنی اور فرانس جیسی عظیم طاقتوں کو اپنی آہنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے آج انسانیت کراہ رہی ہے۔

اشتراکیت کے اصول

یہ نظریہ کارل مارکس کی طرف منسوب ہے۔ مارکس نے اپنے افکار وتصورات کا ڈھانچہ ھیگل کے جنگ اضداد اور تاریخ کے سفر ارتقاء کے فلسفہ پر ہی کھڑا کیا ہے۔ مارکس یہ مانتا ہے کہ جب کوئی نظام اپنے انتہائے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر بعض مخالف قوتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے اور ایک دن پرانے نظام سے ان کی جنگ ہو جاتی ہے۔ چونکہ نیا نظام پرانے نظام کی بہ نسبت صالح، عمدہ اور ترقی پذیر ہوتا ہے، اور پرانے نظام کے صالح اجزاء بلکہ جواہر اس میں موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے نیا نظام حکمرانی کے منصب پر جلوہ گر ہوتا ہے لیکن جب یہ نظام بھی اپنے عروج وارتقاء کی آخری منزل تک پہنچ جاتا ہے تو اس

کے اندر سے باغی نظام ظہور پذیر ہوتا ہے اور وہ مروجہ نظام سے ٹکرا جاتا ہے۔ دونوں کی آویزش سے ایک نئی وحدتِ فکر وجود میں آتی ہے جو پہلے دونوں نظاموں کی بہ نسبت زیادہ جامع اور وسیع ہوتی ہے۔

لیکن اس کے بعد مارکس اس نظریہ کو زندگی کے مسائل پر دوسرے طریقے سے منطبق کرتا ہے جس کی وجہ سے ہیگل کا فلسفہ زیروزیر ہو جاتا ہے۔ اور وہیں سے دونوں کی منزلیں جدا ہو جاتی ہیں۔ ہیگل کے خلاف مارکس کہتا ہے کہ اضداد کی یہ جنگ نظریات تک ہی محدود نہیں بلکہ اصلاً خارجی زندگی میں یہ فعل کارفرما ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک معاشی نظام جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور ترقی کا آخری زینہ بھی طے کر لیتا ہے تو اس کے اندر سے باغی اور سرکش نظام ظاہر ہونے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ معاشی نظام بہت ہی مضبوط ہو جاتا ہے اور تب وقت کے معاشی نظام سے اس کا تصادم ہو جاتا ہے۔ یہ معاشی نظام پہلے کے معاشی نظام سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے کیوں کہ سابق نظام کی تمام خوبیاں اس کے اندر جمع رہتی ہیں۔ پھر جب یہ نظام بھی اپنے بامِ عروج کو پہنچ جاتا ہے تو مخالف قوتوں کا ظہور ہوتا ہے اور اس سے اس کا تصادم ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ ہیگل نے اضداد کی جنگ کو افکار و نظریات تک محدود رکھا تھا۔ لیکن مارکس نے افکار کے بجائے خارجی زندگی اور اس کی معاشی تنظیم پر اس جنگ کو چسپاں کر دیا۔ ہیگل کے نزدیک اولیت فکر کو حاصل ہے اور انسان کی مادی زندگی کو غالب اور افکار و تصورات کو اس کا تابع قرار دیا ہے۔ مارکس نے دعویٰ کیا ''انسان اپنی تاریخ آپ بناتا ہے۔'' وہ مجرد تصورات کا بازیچہ اطفال نہیں کہ جس رنگ میں چاہیں اس کو ڈھال لیں۔ بلکہ افکار و تصورات انسان کے غلام ہیں اور تہذیب و تمدن، سیاست و معیشت، اخلاق و معاشرہ یہ سب زمانہ کے معاشی نظام میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور رائج الوقت معاشی نظام کی طوطی بولنے لگتے ہیں۔

چنانچہ مارکس کے افکار و تصورات کا محور معاش تھا اس لیے اس نے انسانوں کی معاشی زندگی کو درست کرنے کے لیے اشتراکیت و اشتمالیت کا فلسفہ پیش کیا۔ اور اس مقصد کی کامیابی کی خاطر

پوری تاریخ کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ تاریخ کی ساری کشمکش معاشی اسباب و محرکات سے پیدا ہوتی ہے۔ ملک گیری کی لڑائیاں، مذہبی اصولوں کی جنگیں اور ملک کے مختلف عناصر کی باہمی خانہ جنگیاں سبکی تہ میں معاشی اسباب کارفرما رہے ہیں۔ انسان کے ذہنی اور اخلاقی تصورات نہیں بلکہ اس کی مادی ضروریات سیاسی انقلابات کا اصلی سبب ہیں۔ اخلاقی تصورات اور سیاسی رجحانات معاشی نظریات کا آئینہ ہیں۔

ہیگل نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انسان کے ذہنی اور معاشی ارتقاء میں انسان کے افکار و تصورات ہی اصل محرک ہوتے ہیں۔ خارجی ماحول تو بس ایک آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے جس پر یہ عالم مطلق اپنے افکار کا جلوہ دکھاتا ہے لیکن مارکس نے ہیگل کے اس نظریہ کو مسترد کیا اور کہا کہ اصل اہمیت انسانی افکار کو نہیں بلکہ خود انسان کو حاصل ہے خارجی تصورات کے سامنے یہ تصورات بے بس ہوتے ہیں۔ ان تصورات کی نکیل تو خارجی ماحول کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ جدھر چاہتا ہے اس کو گھما دیتا ہے۔

اخلاق کے متعلق مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ اخلاق یا مذہب نام کی مستقل کوئی چیز نہیں بلکہ جو معاشی نظام رائج ہوتا ہے اس سے ہم آہنگ ہو کر بعض اخلاقی قدریں بھی پرورش پاتی ہیں۔ ہر عمل کو اسی نسبت سے اچھا یا بُرا کہا جاتا ہے جس نسبت سے وہ رائج معاشی نظام کو فائدہ پہنچاتا ہے یا اس کی راہ کا روڑا بنتا ہے۔ یہ اخلاقی اصول کوئی مستقل اور دائمی قدر نہیں رکھتے بلکہ زمانے کے بدلنے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مارکس اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا کہ اخلاقی اور مذہبی احکام ازادہ عام کی اساس پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ وہ کہتا ہے کہ اخلاق کا دار و مدار معاشی نظام کی فلاح و بہبود پر ہے۔ ہر دور میں اخلاقی قدریں اچھی اور عمدہ مانی گئیں ہیں جن سے مروجہ معاشی نظام کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ اصول ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اس لیے مارکس کہتا ہے کہ دیکھو غلامی کے دور میں اطاعت و فرماں برداری اور عجز و انکساری کو اعلیٰ ترین اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا لیکن نظام جاگیرداری میں اس کا دور تک پتہ نہیں بلکہ اس دور میں شجاعت، جان نثاری اور بہادری کی بڑی

تاریخ کے متعلق مارکس کا جو نظریہ ہے وہ کس درجہ طفلانہ ہے۔اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تاریخ کے ارتقاء وتنزلی کا سبب معاش ہوا کرتا ہے۔خود انسان کا تاریخ کے بنانے یا بگاڑنے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔اس نے لکھا ہے کہ مشہور تاریخی شخصیتوں کی عظمت کا راز یہ تھا کہ وہ زمانہ کے میلانات کا رخ دیکھ کر کام کرتے تھے۔انہوں نے ایسی تحریکوں کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی جو موجودہ معاشی نظام سے پیدا ہوئی تھیں۔انہوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ عوام الناس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو صحیح رخ پر لگا دیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخی واقعات وحوادث کے اسباب اتنے غیر مربوط ہوتے ہیں کہ ان کا تجربہ کرنا اور ان کو ایک ہی کڑی میں پرونا ناممکن ہے۔سیاسی سازشیں بغض وعناد، نفرت و محبت، مذہبی وتمدنی جذبات اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں مل کر ارتقاء وانحطاط کا سبب بنتی ہیں۔اسی طرح تاریخ شاہد ہے کہ واقعات کے بنانے، سنوارنے یا ان کی تخریب وتعمیر میں اونچی اور عظیم شخصیتوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔بارہا ایسا ہوا ہے کہ کوئی ملک کسی عظیم شخصیت کے نہ پانے کی وجہ سے شکست کھا گیا اور کوئی نسبتاً کمزور ملک عظیم شخصیت کے مالک ہونے اور قابل اعتماد جنرل مل جانے سے فوز ونصرت سے ہمکنار رہوا ہے۔

جنگ کے متعلق مارکس کا نظریہ یہ ہے:

> ”انسان نے اس وقت تک جتنے معاشرے قائم کیے ان سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔غلام اور آقا، امراء اور جمہور، سرمایہ دار اور مزدور مختصر یہ کہ ظالم اور مظلوم ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرپیکار رہے ہیں۔یہ لڑائی صدیوں سے یونہی مسلسل جاری ہے۔کبھی اس کی آگ دھیمی پڑ جاتی ہے اور مخفی طور سے اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے اور کبھی اس کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔پھر اس کا انجام یا تو یہ ہے کہ ایک انقلاب پورے معاشرے کو بدل ڈالتا ہے یا پھر دونوں برسرپیکار بالطبع بالکل مٹ جاتے ہیں۔“(ہیگل مارکس اور اسلام)

یہ صحیح ہے کہ طبقاتی نزاع کو ایک اہم مقام حاصل ہے لیکن صرف اسی کو جنگ و پیکار قرار دینا بے انصافی ہے۔ ایک غیر متعصب شخص اگر غور کرے گا تو وہ دیکھے گا کہ بیشتر قدیم لڑائیوں میں قومی، وطنی و نسلی تفاخر کے جذبات کارفرما تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے اپنی شجاعت و حماست کا لوہا منوانے کے لیے برسر پیکار ہو جاتا تھا۔ اور صدیوں تک یہ لڑائی جاری رہتی تھی اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ انسان فطرتاً جنگجو اور لڑاکا واقع ہوا ہے۔ وہ جب اپنے مقصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ دیکھتا ہے تو اس کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ محض معاشی یا طبقاتی کشمکش سے تاریخی جنگوں کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

مارکس کے نزدیک ہر دور کا فکری نظام مروجہ معاشی نظام سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ تمام فکری تحریکات، سیاسی و تمدنی مظاہر معاشی تبدیلیوں کا سبب ہوتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی کسی پارٹی کے افکار و تصورات معاشی نظام سے وابستہ ہوتے ہیں؟ اور کیا ان افکار و تصورات کی حیثیت بس ایک بالائی عمارت کی ہوتی ہے جو معاشی نظام کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔

مارکس کہتا ہے کہ جب پیدائش دولت کی نئی قوتوں اور حالات پیداوار کے تصادم سے ایک نیا معاشی نظام وجود پذیر ہونے لگتا ہے تو انسان کی ذہنی زندگی میں اسی کے مطابق تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ پیداوار کی نئی قوتوں اور عقلی ترقیوں سے بہت گہرا تعلق ہے۔ نئی پیداواری قوتیں اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتیں جب تک کہ عقل بھی اس ترقی کے معیار پر نہ پہنچ جائے۔ مثال کے طور پر جب انسان وحشیانہ زندگی گذار رہا تھا اور پھل پھول پر قناعت کیا کرتا تھا تو اگر اس وقت بھاپ کا پتہ چل جاتا تو کیا یہ ناممکن تھا کہ انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے؟

ہم ابھی ابھی اوپر لکھ چکے ہیں کہ ہیگل نے تصور پر اپنے پورے فلسفے کی بنیاد رکھی تھی اور انسان کو محض آلۂ کار کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا اور مارکس نے انسان اور خارجی ماحول پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی تھی اس نے بتایا کہ انسان افکار و تصورات کا غلام نہیں بلکہ افکار انسان کے غلام ہیں۔

تفوق تو انسان ہی کو حاصل ہے۔ اس طرح انسان اپنی تاریخ بناتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کہہ چکا ہے کہ بڑے سے بڑا انسان اپنے زمانے کی معاشی قوتوں سے تصادم نہیں کرسکتا وہ تو خارجی ماحول کا غلام ہوتا ہے۔ وہ ماحول کو اپنے افکار و تصورات میں ڈھالنے کے بجائے خود ان کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ مروجہ معاشی نظام کے مطابق وہ سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنا کام بھی کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی عظمت و رفعت کی حکمرانی کرنے کے بجائے خود ماحول کے دھارے میں بہتا چلا جائے؟ کیا عظمت و عزیمت کی راہ یہی ہے کہ وہ ماحول کو اپنے رنگ میں رنگنے کے بجائے خود اسی کے رنگ میں ڈھل جائے؟ اور وہ ماحول کو اپنے افکار کے مطابق بھی نہ بنا سکے؟ کیا ایسی صورت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ ''انسان اپنی تاریخ آپ بناتا ہے''؟

بڑے آدمیوں کے بارے میں مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول کا پابند اور خارجی قوتوں کا تابع ہوتا ہے وہ ماحول کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کے اندر اگر کچھ کرنے کی استطاعت ہے تو صرف اتنا کہ انجام و عواقب پر غور کر کے اپنا کام شروع کر دے اور انسانوں کی ایک جماعت کو صحیح راہ پر لگا دے۔ اس سے زیادہ اس کے بس میں کچھ نہیں۔

لیکن عظمت تو اس میں ہے کہ انسان اپنے ماحول سے اثر لینے کے بجائے خود اس پر اثر انداز ہو۔ منفعلانہ جذبہ کی جگہ فاعلانہ جذبہ رکھتا ہو۔ زمانہ سے کچھ لینے کے بدلے اس کو دینے کا مشتاق ہو۔ پھر جب تک انسان کی تسخیری صلاحیتیں ماحول پر غالب ہو جاتی ہیں وہ عظیم و رفیع ہوتا ہے۔ بڑے بڑے انسانوں کی عظمت کا راز یہی تھا کہ انہوں نے ماحول پر اپنا تصرف کیا۔ وہ ایام کا مرکب نہیں راکب بنے اور ماحول کی قوتوں کو اپنے تابع کر لیا اور ان کی تکمیل اپنے مقصد کی منزل کی طرف موڑ دی۔ اگر مارکس کا یہ نظریہ صحیح مان لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مارکس لینن اور ان کے ساتھی تو زار کی حکومت میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے غلامی اور مفلسی کی زندگی میں آنکھ کھولی تھی پھر زمانے کی مخالفت کیسے کی؟

روس کی لیبارٹری میں

یہ تو اس نظام کی فکری غلطیاں تھیں اب آیئے ہم دیکھیں کہ تجربہ گاہ روس میں اس کا کیا ردّعمل رونما ہوا اور جس معاشرے کی تشکیل کے لیے سارے پاپڑ بیلے جا رہے تھے کیا وہ معاشرہ واقعی وجود میں آ گیا؟ اور بے قید معیشت سے جو خرابیاں پیدا ہوئی تھیں کیا وہ دور ہو گئیں یا اس سے بدتر خرابیاں مول لینی پڑیں۔

غیر طبقاتی سماج: ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے کہ ''واردنشرج'' شہر کے لال دستہ کے کمانڈر نے پروفیسر دپوک لسکی کے دوسرے بستر کو ضبط کر لیا پروفیسر مذکور نے لینن کو اس بات کی شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ ''کمانڈر نے یہ کہہ کر کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہی بستر پر ہوتا ہے اس لیے اسے دوسرے بستر کی کیا ضرورت ہے ضبط کر لیا، لینن نے کمانڈر کے فعل کو درست قرار دیتے ہوئے جواب دیا اس میں یہ شک نہیں کہ ایک دانشور کی یہ خواہش بالکل معقول اور جائز ہے کہ اس کے پاس دو بستر ہوں، ایک خود اس کے لیے دوسرے اس کی بیوی کے لیے۔ لیکن آج تک ایک عام روسی شہری ایک بستر سے بھی محروم رہا ہے۔

اس دور میں مساوات کو مذہب کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا ہے۔ انسانوں کے درمیان برابری کا رشتہ قائم کرنے کے لیے آخری حد تک کوششیں کی گئیں۔ برابری کا یہ تصور محض ایک ذہنی تصور نہیں تھا۔ یہ نظریہ محض روحانیت تک محدود نہ تھا بلکہ یہ تو انسانوں کی ایک ابتدائی خواہش کا اظہار تھا۔ جسے ایک عظیم انقلابی اُبھار نے جنم دیا تھا۔ مساوات کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل تھیں ان کو مکمل طور پر بلا کسی تاخیر کے پاش پاش کر دینا چاہیے۔ نومبر انقلاب کا روحانی تقاضا یہی تھا چنانچہ مکانوں کے کمروں اور آنگنوں کی پیمائش کی گئی اور ان کا بٹوارہ بھی کر دیا گیا۔ کسانوں نے جاگیرداروں کی جاگیروں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ کل کارخانوں پر مزدوروں نے قبضہ کر کے مالکوں کو گلی کوچوں میں آوارہ گردی کے لیے ڈھکیل دیا۔ بھوکے شہریوں کے قافلوں نے دیہاتوں

میں جا کر اناج کے گوداموں کو لوٹ لیا۔ فوج کے سپاہیوں نے افسروں کی وردیوں کے امتیازی نشان اتر کر پھاڑ دیے۔ فوجیوں کی تمام درجہ بندی اڑا دی گئی تا کہ پرانے نظام کی برابری کا کوئی نشان نہ رہ جائے۔ تمام پرانے عناصر انقلاب کی آگ میں بھسم ہو گئے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس شہزادیاں مزدوروں اور سوئٹ سرکار کے ملازموں کے دسترخوان بچھانے لگیں۔ شاہی خاندان کی دوشیزائیں گلیوں اور سڑکوں کو برف سے صاف کرتی ہوئی دیکھی گئیں۔

لیکن مساوات کا یہ جوش وخروش بہت جلد ٹھنڈا پڑ گیا۔ جب ۱۹۲۰ء کے بعد کے برسوں میں اقتصادی تعمیر کا دور شروع ہوا تو یہ محسوس کیا گیا کہ اس ظاہری مساوات کو ہزاروں جگہوں پر ختم کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو روس میں اقتصادی ترقی ممکن نہ ہو گی۔ جب کسانوں کو کھلی منڈی میں اشیا بیچنے کا حق دیا گیا تو آمدنیوں میں کافی امتیاز پیدا ہونے لگا۔ مزدوروں اور سرکاری ملازموں کے درمیان نابرابری اُبھرنے لگی۔ اوپر سے ''مساوات - مردہ باد'' کا نعرہ دیا گیا۔ جس نے بھی اس نعرہ کی مخالفت کی اسے گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ اسٹالن نے کئی بار یہ کہا ''کہ یہ کہنا بے ہودگی ہے کہ سکۂ زر غیر ضروری ہے اور تجارت کا زمانہ اب ختم ہو چکا ہے۔'' جب اس نے سماجی برابری کا نعرہ سنا تو اس نے اس کا تمسخر اڑا دیا:

> ''یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ سوشلزم کا مطلب برابری، سماج کے ممبروں کی ضرورت اور زندگی میں برابری ہے۔ یہ نعرے بائیں بازو کے مفلوج ذہن کے نیم بورژوازی تصورات ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بائیں بازو کے ان مفلوج ذہنوں کی بچکانہ حرکات سے ہماری محنت کو کتنا بھاری نقصان پہنچا ہے۔ یہ لوگ اس بات کے سمجھنے کے نااہل ہیں کہ سکۂ زر کے اصول پر چلنے والی اکائی کافی عرصہ تک ہمارے ساتھ چلے گی۔''

طبقۂ انبیاء

ایک تیسرا گروہ ان انبیاء و صلحاء کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آ گئی

ہے بلکہ اس کا ایک خالق، مالک، حاکم، مدبر اور منتظم وفرماں روا بھی ہے۔ انسان کو اسی مقتدر اعلیٰ نے پیدا کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ہدایت کا سامان بھی مہیا کیا ہے، انبیاء اس کی ہدایت کا پیغام لے کر آتے رہے اور انسانیت کو راہِ حق سے روشناس کراتے رہے، آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہیں ﷺ پر اللہ نے اپنی آخری کتاب اتاری۔ قرآن عالم انسانیت کے نام ایک جامع اور اکمل پیغام ہے، یہ فتنہ وفساد کو ختم کرنے کے لیے قوانین واحکام نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ شعور بھی عطا کرتا ہے کہ جس طرح موسموں کے تغیر کے ساتھ زندگی کی مختلف انواع پلٹ کر آتی ہی رہتی ہیں، پھول مرجھاتے ہیں اور پھر لوٹ آتے ہیں، سبزۂ بیگانہ اپنا سبز باناتی فرش بار بار بچھاتا ہے اور پھر زرد رو ہو کر مرجھا جاتے ہے۔ لیکن بارش کی چند چھینٹوں سے پھر اپنی وہی سبز وادی پہنے ہوئے لوٹ آتا ہے تو کیا صرف انسان ہی کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ مر کر دوبارہ لوٹ نہ سکے؟ انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا اس کے اعمال کی باز پرس نہیں ہوگی؟ کیا وہ دنیا میں کیے گئے اپنے ظلم واستبداد اور طغیان وسرکشی کا مزہ نہیں چکھے گا؟ کیا مظلوم کو کہیں انصاف نہیں ملے گا؟

خدا کی طرف سے بھیجا ہوا آخری نظامِ حیات اور دستورِ عمل، اسلام، انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے چاہے وہ دینی ہوں یا دنیاوی، سیاسی ہوں یا معاشی، اخلاق سے ان کا تعلق ہو یا معاشرت سے، یہاں گفتگو اقتصادی مسئلہ پر ہو رہی ہے، اس لیے ہم اس پہلو کو مختصراً اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔

اسلام ایک معتدل نظام

اسلام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں نظاموں کے درمیان معتدل نظام قائم کرتا ہے، جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ فرد کو اس کے پورے شخصی حقوق بھی دیے جائیں اور اس کے ساتھ تقسیم ثروت کا توازن بھی نہ بگڑنے پائے، ایک طرف وہ فرد کو شخصی ملکیت کا حق اور اپنے مال میں

تصرف کرنے کے اختیارات دیتا ہے، دوسری طرف وہ ان سب حقوق اور اختیارات پر باطن کی راہ سے کچھ ایسی اخلاقی پابندیاں اور ظاہر کی راہ سے کچھ ایسی قانونی بندشیں لگا دیتا ہے، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ثروت کا غیر معمولی اجتماع نہ ہو سکے، اس کی نمایاں ترین صفت یہ ہے کہ یہ لوگوں کو کسی کام پر ابھارنے کے لیے اخلاق اور قانون دونوں سے مدد لیتا ہے، اپنے اخلاقی و قانونی طور پر طریق سے وہ جماعت کے ہر فرد کو اپنی طاقت کے لیے آمادہ کر لیتا ہے اور ان پر کچھ بندشیں بھی ڈال دیتا ہے جو اس کو اس نظام کے اندر رہنے پر مجبور کر دیں۔ معاشیات سے متعلق قرآن نے جن اساسی اصولوں کا تذکرہ کیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ حق معیشت میں مساوات

انسان اس کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ معاشرے میں چند افراد ساری دولت پر کنڈلی مار کر بیٹھ جائیں اور عوام فقر و فاقہ اور قحط و خشک سالی کے شکار ہو جائیں، وہ چاہتا ہے کہ اگر کچھ لوگ معیشت میں ترقی کر کے کروڑ پتی بن جائیں تو اس کا دوسروں کے حق معیشت پر اثر نہ پڑے اور وہ اس کی وجہ سے خستہ حالی و بدحالی کا شکار نہ ہوں، ان کی وجہ سے غریبوں پر رزق کے دروازے بند نہ ہو جائیں، بلکہ ہر شخص کے لیے ترقی کی راہ ہموار ہونی چاہیے:

قَالَ عُمَرُ لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ لَاَخَذْتُ فُضُوْلَ اَمْوَالِ الْاَغْنِیَاءِ فَقَسَّمْتُهَا عَلٰی فُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِیْنَ۔

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس بات کا مجھے آج اندازہ ہوا ہے، اگر اس کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو میں کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلاشبہ ارباب ثروت کی فاضل دولت لے کر فقراء ومہاجرین میں بانٹ دیتا۔''

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ اَنَّهٗ سَمِعَ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ یَقُوْلُ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی فَرَضَ عَلَی الْاَغْنِیَاءِ فِیْ اَقْوَاتِهِمْ بِقَدْرِ مَا یَکْفِیْ فُقَرَآءَ هُمْ فَاِنْ جَاعُوْا

او عَرُوْا او جهدوا فبمنع الاغنياءِ وحق عَلٰى الله تعالىٰ ان يحاسبهم يوم القيامة ويُعَذِّبَهُمْ عليه

''حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریبوں کی معاشی حاجت کو بدرجۂ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے، پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے تو محض اس لیے کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی باز پرس کرے گا اور کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا۔''

۲۔ درجاتِ معیشت

معیشت میں مساوات کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ سب کی اجرت ایک ہو اور سب کا معیار زندگی برابر ہو بلکہ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ معیشت کے حصول کا موقع ہر شخص کو یکساں ملنا چاہیے، رہی معیشت میں درجہ بندی تو یہ ضروری ہے کیوں کہ امارت و غربت تو فطری چیزیں ہیں:

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ۔[۲]

''کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنا چاہتے ہیں، ہم نے ان کی روزی اس دنیا میں ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور بعض کو بعض پر بلند درجہ عطا کیا ہے۔''

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۔[۳]

''اسی نے تم کو زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے اور تم میں سے بعض کو بعض پر بلند مرتبے عطا کیے ہیں تاکہ دی ہوئی نعمتوں میں وہ تم کو آزمالے۔''

۳۔ اِحتکار کی حرمت

تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلام احتکار سے منع کرتا ہے اور اس کے مرتکبین کو سخت سزا کا موجب گردانتا ہے، کیوں کہ ذخیرہ اندوزی سے معاشرے میں ساری معاشی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔ يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَـذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُواْ مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ۔[۴]

''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو جس دن کہ جہنم کی آگ میں انہیں جھونک دیا جائے گا اور اس سے ان کے چہرے پہلو اور پشت داغے جائیں گے اور کہا جائے گا یہی ہے وہ چیز جسے تم جمع کرتے رہے تھے تو جو کچھ جمع کرتے رہے تھے اس کا مزہ چکھو۔''

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْراً لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُواْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔[۵]

''اللہ نے جن کو اپنے فضل سے نوازا ہے اور وہ اس میں کنجوسی کرتے ہیں تو وہ نہ سمجھیں کہ ان کے لیے بہتر ہے بلکہ یہ ان کے لیے شر ہے، عنقریب ان کی گردن میں ان تمام اموال کا طوق ڈال دیا جائے گا۔''

اسلام نیک راہ میں اموال خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں بار بار اس حکم کا اعادہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مال ہے ہی اس لیے کہ اسے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جائے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِيْ الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔[۶]

''یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو نیز یہ گردنوں کو چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں، ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔''

۴۔ فاسد معیشت کا انسداد

اسلام ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیتا ہے جو مضر ہوں جن سے اخلاقی و روحانی اور تمدنی و معاشرتی زوال پیدا ہو اور جس سے انسانیت پر ضرب آنے کا اندیشہ ہو، چنانچہ قرآن صاف طور سے کہتا ہے:

وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا۔[۷]

''اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔''

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ۔[۸]

''یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو۔''

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ۔ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ۔ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ۔[۹]

''ہلاکت ہے کم کردینے والوں کے لیے کہ جب وہ لوگوں کی چیزوں کو ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب انہیں ناپ کر دیں یا وزن کر کے تو کم کر دیں۔''

بکثرت احادیث میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ وہ چیزیں استعمال نہ کرو جن سے کبر و غرور اور تعیش کی بو ٹپکتی ہو۔ آپ نے فرمایا:

لاتشربوا فی إنآء الذهب والفضّةِ ولاتلبسوا الديباج والحريرَ فإنّه لهُم فی الدنيا وهولكم فی الآخرة يوم القيامةِ۔[۱۰]

''سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور حریر اور ریشم کے لباس استعمال نہ کرو۔ یہ چیزیں اُنہیں دنیا میں حاصل ہیں اور تمہیں قیامت کے روز حاصل ہوں گی۔''

وقال رسول الله ﷺ من لبس ثوب شهرة فی الدنيا البس الله ثوب مذلة يوم القيامة۔[۱۱]

''اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے شہرت کے لیے دنیا میں کپڑے پہنے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے ذلت کا لباس پہنائے گا۔''

وعن حذيفة قال نهانا النبی ﷺ ان نشرب فی انية الذهب والفضة وأن ناكل فيها، وعن لبس الحرير والديباج وأن نجلس عليه۔[۱۲]

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے سے منع کیا ہے اور حریر و ریشم کو پہننے سے اور اس پر بیٹھنے سے منع کیا ہے۔''

مصارف کے بنیادی اصول

اسلام یہ بھی متعین کر دیتا ہے کہ اموال کہاں خرچ کیے جائیں، اس طرح وہ فاسد راہیں بالکل مسدود کر دیتا ہے جن سے فحش کے پھیلنے کا اندیشہ ہو اور ان تمام بنیادوں کو منہدم کر دیتا ہے جن پر غلط معیشت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، قرآن صراحۃً حکم دیتا ہے:

وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْراً۔ إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُوْراً...... وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْماً مَّحْسُوْراً۔ [۱۳]

''اور رشتہ داروں مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دو اور فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا نافرمان ہے......
اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں نہ باندھے رکھو اور نہ اسے پوری طرح کھول دو کہ تم (آخر میں) قابل ملامت وحسرت ٹھہرو۔''

پھر قانون کے ساتھ ساتھ قرآن اخلاقی قدغن بھی عائد کر دیتا ہے، اس کا سارا فلسفہ ہی عقیدۂ توحید وآخرت اور حیات بعد الممات پر قائم ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر دنیا کی بے ثباتی انسان کی نگاہوں کے سامنے ہو اور خدا کا خوف دل میں جاگزیں ہو تو یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا میں فتنہ و فساد کا ارتکاب کرے۔

یہی ایک کرن ہے جو ظلمتوں کی اس وادی میں ہمیں نظر آتی ہے، اگر ہم دنیا کے مسائل کا حقیقی حل چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اسلام کی طرف پلٹیں اور اپنے مسائل اسی کے اصولوں کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کریں۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ Chatterjee. B.B.. Outline of General Philosophy. p. 31

۲۔ قرآن کریم، زخرف: ۳۲

۳۔ قرآن کریم، انعام: ۱۶۵

۴۔ قرآن کریم، توبہ: ۳۴-۳۵

۵۔ قرآن کریم، آل عمران: ۱۸۰

۶۔ قرآن کریم، توبہ: ۶۰

۷۔ قرآن کریم، بقرہ: ۷

۸۔ قرآن کریم، مائدہ: ۹۰

۹۔ قرآن کریم، مطففین: ۱-۳

۱۰۔ صحیح مسلم، کتاب اللّباس و الزینة، حدیث نمبر ۴

۱۱۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، حدیث نمبر ۲۴

۱۲۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب افتراش الحریر، حدیث نمبر ۵۸۳۷

۱۳۔ قرآن کریم، بنی اسرائیل: ۲۶-۲۷، ۲۹

☆☆☆

ابوالخبائث۔سگمنڈ فرائڈ

ہمہ گیر سازش

عصر جدید کے مفکرین نے موجودہ نسل کو یہ بات بخوبی ذہن نشین کرادی ہے کہ اگر وہ مذہب، اخلاق وروایات اور سماجی بندھوں سے اپنا دامن چھڑا لے اور جنسی وصنفی میدان کی تمام رکاوٹوں کو اپنے راستے سے ہٹا دے تو وہ برابر ارتقاء حاصل کرتی رہے گی اور منزل مقصود کے حصول یعنی ایک مثالی معاشرہ کے قیام میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی، چنانچہ عصر جدید کے علماء و مفکرین نے ہمہ گیر سازش کی اور الحاد و بے دینی کی اشاعت کے لیے لائبریریوں کی لائبریریاں کتابوں سے بھر دیں، جس نے نفسیات پر گفتگو کی اس نے کہا کہ مذہب اخفاء (Suppression) اور بدترین جرم کی پیداوار ہے، یہ نفسیاتی امنگوں کی مضمحل کر دیتا اور اس کی ترقی کے راستے مسدود کر دیتا ہے، لہٰذا اس اضمحلال کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ فرد کے نفسیاتی وجود کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔

جس نے اقتصادیات پر قلم اٹھایا اس نے لکھا کہ صنعتی معاشیات ایک آزاد معاشرے کی موروثی بندشوں سے آزاد ہو، اُن ہی بندشوں میں سے ایک بندش مال کے فرائض کی انجام دہی ہے۔ صنعتی معاشرے کا تقاضا ہے کہ عورت میدان عمل میں کود پڑے۔

اجتماعیات پر کلام کرنے کی کوشش کی تو مذہب کو غیر فطری اور بدویانہ زندگی کی پیداوار ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، صاف صاف کہا کہ مذہب کی بنیاد جہالت و بیوقوفی، پسماندگی وخرافات اور دیو مالائی کہانیوں پر ہے اور اب موجودہ صدی کی تہذیبی ترقیات کے سامنے اس مذہب کی کوئی ضرورت نہیں۔

جنہوں نے خالص سائنسی علوم پر گفتگو کی انہوں نے بھی مذہب کا پیچھا نہ چھوڑا، واضح لفظوں میں کہا ''جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات

ختم ہو گئے، اسی طرح پچھلی صدی میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی ایک قسم کا علمی دھما کہ ہے جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے۔" ایک امریکی مفکر کے الفاظ میں " سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مذہب تاریخ کا سب سے زیادہ دردناک اور سب سے بدترین ڈھونگ تھا۔"

جولیان ہکسلے لکھتا ہے:

> " نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو، لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں، ڈارون اور پاسچر نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹا دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے۔"[1]

جس نے آرٹ اور فن کی چھان بین کی اور اسے مرتب و مدون کیا، اس نے شرم و حیا، اخلاق و کردار، عفت و عصمت اور پردہ و ستر پوشی کا ضرور مذاق اڑایا اور بے قید، باحیت اور رنگا رنگ جمال سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی تعلیم دی اور زن وشو کو برہنہ کر کے جنسی دلچسپیوں کی تکمیل کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔

جن لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا، انہوں نے بتایا کہ مذہبی تصورات پیدا ہونے کی وجہ سے وہ مخصوص صورتحال اور تاریخی حالات ہیں جو زمانہ ماضی میں انسان کو گھیرے ہوئے تھے، سائنسی دریافتوں سے پہلے سیلاب طوفان اور بیماری وغیرہ سے بچنے کے لیے انسانوں نے مذہب کا سہارا لیا تھا جس کی اب کوئی ضرورت نہیں جس طرح دوسرے اسباب مذہب کو بیدار کرنے میں اثر انداز ہوئے ہیں اسی طرح اس میں سیاسی اور تمدنی حالات کا بھی دخل رہا ہے، زاؤں کے نام اور ان کی صفات خود بخود وقت کے نظام سلطنت کی صورت میں ڈھل گئے، خدا کو بادشاہ ماننے کا

عقیدہ محض انسانوں کی بادشاہت کی بدلی ہوئی شکل ہے اور آسمانی بادشاہت صرف زمینی بادشاہت کا ایک چربہ ہے..... نیز چونکہ بادشاہ سب سے بڑا جج ہوتا ہے اس طرح خدا کو بھی عدالت کی کارروائیاں سپرد کر دی گئیں اور یہ عقیدہ بن گیا کہ وہ انسان کی نیکی یا بدی کے بارے میں آخری فیصلہ کرے گا، اس قسم کا عدالتی تصور جو خدا کو محاسب و مجازی مانتا ہے، اس نے نہ صرف یہودیت میں بلکہ عیسائیت اور اسلام کے مذہبی نقطۂ نظر میں بھی مرکزی مقام حاصل کر لیا ہے۔[۲]

جولیان ہکسلے اپنی کتاب "Man in the Modern World" میں لکھتا ہے:

> ''مذہب نتیجہ ہے انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ایک خاص طرح کے تعامل کا۔ اب چونکہ وہ مخصوص ماحول ختم ہو گیا ہے یا کم از کم ختم ہو رہا ہے جو اس کے تعامل کو وجود میں لانے کا ذمہ دار تھا اس لیے اب مذہب کو زندہ رکھنے کی بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔''[۳]

جن لوگوں نے ارتقا کو موضوع بحث بنایا انہوں نے انسان کو حیوان سے مماثل قرار دینے میں خون پسینہ ایک کر دیا، اس نظریہ میں اصل بنائے کار مادہ ہے، نفس و روح اور عقل و شعور وغیرہ مادہ ہی کی ایک صورت اور اسی کی نشو و ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔ ان فلسفیوں نے انسان کی میکانکی توجیہ اس طور سے کی کہ مادیت کو اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر دیا اور روحانیت کے داخل ہونے کا کوئی دروازہ ہی کھلا نہ چھوڑا، انہوں نے فضیلت و شرافت اور نیکی و بدی کے پیمانے ہی بدل دیے اور انسانی اقدار کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

غرضیکہ علم و فن کے ان محققین نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی، منطق و فلسفہ، اخلاقیات و نفسیات اور تمام علوم عقلیہ میں انقلاب برپا کر دیا۔ انتہائی بیباکی و جرأت کے ساتھ قدیم موروثی افکار و نظریات پر تنقید و تنقیص کر کے ایک نئی دنیا بسائی، اسی کا نتیجہ ہے کہ آزادی و اباحیت اور وسیع المشربی کا بول بالا ہے۔ منفی خواہشات کی تکمیل پر کوئی پابندی نہیں، جنسی اختلاط روا بلکہ تہذیب و ثقافت کی علامت ہے۔ حسن و جمال کے مجسمے، ننگی ٹانگیں، عریاں سینے اور پنڈلیاں گرم گرم

سانسیں، حرارت سے بھرپور لچکتی ہوئی باہیں، لپکتے ہوئے صنفی شعلے، چیکے ہوئے جسم، بھڑکتے ہوئے شہوات...... کیا ایسے ہیجان انگیز لمحات میں سینوں میں ایمان محفوظ رکھنا آسان ہے؟

کیا اس فتنہ پرور ماحول میں نوجوان خدا کو یاد کر کے ان ہیجانات سے محفوظ رہ سکتا ہے؟ حسن و جمال کی یہ بجلیاں کیا اس کے خرمن دل کو جلا نہ دیں گی؟ عشق و محبت کے یہ مظاہر کیا اس کے متاع ایمان کو لوٹ نہ لیں گے؟ عفت و عصمت کے یہ راہزن کیا اس کی شرافت و نجابت پر ڈاکہ نہ ڈالیں گے؟

پورے ماحول نے مطالبہ کیا کہ آزادانہ جنسی اختلاط وقت کی اہم ضرورت ہے، یونیورسٹیوں میں یونیورسٹی اسپرٹ کے طور پر اختلاط ہونا چاہیے، طالبات یونیورسٹی کے سبزہ زاروں، پارکوں اور کلب گھروں میں طلبہ سے ملتی رہیں اور انہیں آزادانہ خلوت کا موقع ملتا رہے۔ فضا نے ہانک لگائی، صنف نازک کو دفتروں، دکانوں اور کارخانوں کی زینت بننے کا موقع دیا جائے تاکہ اختلاط سے اجنبیت ہی ختم ہو جائے اور مرد و زن دونوں مل کر تمدن کی گاڑی کو آگے بڑھا سکیں۔

عورت کی خودی کو مسلسل جگانے کی کوشش کی گئی۔ اے عورت! تو بڑی دلکش و دلفریب اور حسین ہے، تو شمع محفل بنائی گئی ہے، تو اپنے حسن کے جادو کیوں نہیں جگاتی؟ تو اس چمن کی بلبل ہے، فضا میں نغمے کیوں نہیں بکھیرتی؟ تو ساز ہے تیری موسیقیت اور رعنائیوں سے یہ کائنات مست کیوں نہیں ہو جاتی تو حسن و جمال کی ملکہ ہے، مردوں کو اپنے او پر فریفتہ کیوں نہیں کرتی؟ تو کب تک قدامت و رجعیت کا شکار رہے گی؟ تیرے حسن جہاں تاب کا یہ اخفاء تا کجے؟

ادب و فن نے آواز لگائی!

اے ادیبانِ انجمن کائنات! ماہرین فن نفسیات و جمالیات! سامان زینت و آرائش کے کارخانو! حسن و جمال کے مراکز! سینما، تھیٹر اور کلب گھر کے مالکو! دیکھو جنس لطیف کی آگ کے شعلے سرد نہ ہو جائیں، ''ہَلْ مِنْ مَّزِیْد'' کا تقاضا کرتے رہو کہ جمال اور نکھر جائے، شہوانی جذبات

کو انگیخت کرتے رہو کہ یہ اپنے شباب کو پہنچ جائیں، سلیم الفطرت لوگوں کو بھی مدہوش کر دینے والے اسکرٹ، عریاں سینے، برہنہ پنڈلیاں چال میں لچک اور ترنم ریز سریلی آواز- گندے افسانے، جنسی ورومانی ناول، رقص وسرود کی محفلیں اور عورت کو ننگا کر دینے والی فلمیں اور آرٹ۔

اے مرکزِ حسن! دیکھ کہیں مذہب تیری راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے، روایات تجھے اپنی بندشوں میں نہ جکڑ لیں! سماج تیرا استحصال کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔

اے نوجوان! عشق ومحبت کے دلدادہ! حسن و جمال کے شیدائی کیا تو دنیا کی رنگینیوں سے کنارہ کش ہو جائے گا جبکہ یہ کائنات تیرے لیے ہی سجائی گئی ہے، کیا تو قدامت و رجعیت کی بھینٹ چڑھ جائے گا، جبکہ ہر طرف جدت کا دور دورہ ہے، پاگل ہے تو، آگے بڑھ، بوس وکنار کا مزہ لے، دنیا کی رنگینیوں سے فائدہ اٹھا، اپنی ذات کا اثبات کر! حسن و جمال تجھے مرحبا کہنے کے لیے تیار ہے۔

اجتماعی بگاڑ کی چند مثالیں

اس طرح آزادی و بے قیدا باحیت کا دام ہمرنگ زمیں پوری دنیا پر بچھا دیا گیا، لوگ اسے تہذیب وترقی سمجھ کر اس میں بتدریج پھنستے گئے اور آج دنیا کی جو حالتِ زار ہے وہ سامنے ہے۔

لندن میں جتنی لڑکیاں آج بے گھر اور دردر ماری ماری پھر رہی ہیں اتنی اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں! یہ چونکا دینے والی رپورٹ حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایسی لاتعداد لڑکیاں دیہات یا دوسرے علاقوں کی رہنے والی نہیں بلکہ لندن میں رہنے والے خاندانوں ہی سے متعلق ہیں۔ اس سے بھی زیادہ دل دہلا دینے والی بات یہ ہے کہ ان لڑکیوں کے ماں باپ ان کی بالکل پروا نہیں کرتے کہ وہ کہاں رہتی اور کیا کرتی ہیں۔

لندن سے شام کے وقت شائع ہونے والے ایک میگزین نے جو ایمر جنسی نائٹ سنٹر اور ایک ہوسٹل چلانے میں تعاون دیتا ہے، لکھا ہے کہ لڑکیاں دروازوں پر دستک کا انتظار کرتی

رہتی ہیں اور جب وہ کسی کے ساتھ جاتی ہیں تو پھر لوٹ کر واپس نہیں آتیں، لڑکیوں میں یہ رجحان پچھلے تین برسوں میں ہی دیکھنے میں آیا ہے، رپورٹ میں دکھایا گیا ہے کہ ایسی جوان لڑکیوں کی تعداد کافی زیادہ ہے جن کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے، صرف پچھلے ایک سال کے اندر ہی اندر جنوبی لندن میں واقع ایمرجنسی نائٹ سنٹر نے ۱۶ سے ۲۱ سال کی عمر کی ۲۵۷ لڑکیوں کو پناہ دی جن میں سے بیشتر کو پولیس اور سماجی تنظیموں کی معرفت ان کے گھروں پر واپس بھیج دیا گیا۔

لندن میں ۱۹۷۶ء کے درمیان ۱۰ سال سے ۱۶ سال کی عمر کے تقریباً پینتیس ہزار بچے ۵۹ ہزار سے ہی زائد جرائم کے مرتکب ہوئے، ان جرائم میں، قتل کے ۱۵۷۱، اقدام قتل کے ۱۵۱۳، لوٹ مار اور چوری کے ۵۳۶۷ واقعات شامل ہیں۔لندن کے ایک پولیس آفیسر نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ اصلاً جرائم اس سے زیادہ ہوئے ہیں، کیوں کہ عموماً چھوٹے چھوٹے واقعات کی لوگ رپورٹ نہیں کرتے، رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ لڑکوں میں سنگین جرائم کرنے کا رجحان پہلے کے مقابلے میں بڑھ گیا ہے، جن بچوں کو عدالتوں سے سزائیں ہوتی ہیں ان کے سابق ریکارڈ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بیشتر کھاتے پیتے گھرانوں کے ہیں جو اب عادی مجرم ہو گئے ہیں۔[۳]

لندن سے شائع ہونے والے دوسر کردہ اخباروں نے اسکولوں میں دی جانے والی جنسی تعلیم کے اثرات پر طویل مضامین شائع کیے ہیں۔ایک مضمون نگار نے لکھا ہے کہ جنسی تعلیم نابالغ لڑکیوں اور لڑکوں کو بدکاری کی طرف رہنمائی کررہی ہیں! بارہ سے سولہ سال تک کی ہزاروں لڑکیاں حاملہ ہورہی ہیں۔شادی سے قبل ہزاروں لڑکیاں مانع حمل آلات اور ادویہ کا استعمال کررہی ہیں، عیسائیوں کی ایک جماعت نے مطالبہ کیا ہے کہ اسکولوں میں جنسی تعلیم کا سلسلہ ختم کردیا جائے، اس کا کہنا ہے کہ جنسی تعلیم جاری رکھنے کا سلسلہ دراصل ایسی بڑی بڑی کمپنیوں کے دباؤ پر چل رہا ہے جو اس تعلیم کے ذریعہ مانع حمل ادویہ کا کاروبار کررہی ہیں اور ان کمپنیوں کے ایجنٹ مختلف جماعتوں اور طلبہ کو انعامات دے کر یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ جنسی تعلیم کا

سلسلہ جاری رہنا چاہیے، ایک مشہور سماجی کارکن مس گریٹ نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ہمارا معاشرہ بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی کو روکنے میں ناکام رہا ہے، اس بدعت کا علاج اسلام کو اپنا کر ہی کیا جا سکتا ہے۔[۴]

بنکاک (تھائی لینڈ) میں ۱۴ر جولائی ۱۹۷۶ء کو چھریرے اور متناسب الاعضاء بدن کی ایک دوشیزہ نے اپنے سے دوگنا وزن والے قد آور مرد کو اٹھا کر پٹخ دیا اور دوسری عورت نے حملہ کرنے کے لیے آنے والے مرد کو آسانی سے زمین پر چت کر دیا۔

۱۵ تا ۵۰ سال کی درمیانی عمر کی لڑکیوں اور عورتوں نے تھائی لینڈ کی باکسنگ، کراٹے چاپ، جوڈو اور تلواروں کی وار کا شاندار مظاہرہ کیا، اس نجی ادارہ میں سیکھنے والی عورتیں جسم کو سڈول بنانے کے لیے آتی ہیں لیکن ان کی اکثریت تھائی لینڈ کے سب سے بڑے مسئلے زنا بالجبر سے نمٹنے کے لیے یہ سب کچھ سیکھتی ہے گذشتہ سال ۲۵۴۰ زنا بالجبر اور ۵۷۰۰ جنسی حملے کے واقعات ہوئے تھے، خیال ہے کہ اصلی اعداد اس سے زیادہ ہوں گے کیوں کہ عورتیں زنا بالجبر اور جنسی حملوں کی باتیں بتاتی نہیں ہیں۔ تھائی لینڈ کے اخبارات میں روزانہ زنا بالجبر کی خبریں شائع ہوتی ہیں، وزیر اعظم نے پہلی بار دستور کے تحت اپنے اختیارات کا استعمال کر کے فوری انصاف کے تحت زنا بالجبر اور دو عورتوں کے قاتل کو موت کی سزا دلوائی ہے۔

گذشتہ ہفتہ میں ایک دن میں زنا بالجبر کے ۵ واقعات ہوئے جس میں ایک ۸ سالہ بچی کے ساتھ ایک شخص نے منہ کالا کیا تھا جو کہ بدھ بھکشو کے زرد لباس میں ملبوس تھا، تھائی لینڈ میں کھلی عصمت فروشی کے باوجود یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ تھائی لینڈ میں ہزاروں قحبہ خانے، جسمانی مالش کے ادارے اور جنسی وصنفی ہوٹل ہیں۔[۵]

فطرت کی طرف واپسی کا مطالبہ

بڑے بڑے مفکرین اس فساد زدہ صورت حال پر مضطرب و پریشان ہیں اور اس کا کوئی

مناسب حل ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ اب انتہا ہو چکی ہے گمرہی اب حد سے گذر چکی ہے، اب فطرت کی طرف واپس آ جاؤ، اخلاق و کردار کی طرف لوٹ آؤ، مشرقی ورثہ کو گلے سے لگا لو، ضبط کی قوتوں کو کام میں لاؤ، تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو مستقبل کو تہس نہس کر رہے ہو، پوری انسانیت کی ہلاکت و فلاکت کے لیے سامان مہیا کر رہے ہو۔

یہ آوازیں مختلف حلقوں سے آ رہی ہیں- ان افراد کی جانب سے جو مغربی معاشرے میں پلے بڑھے ہیں، جو بے قید اباحیت کا مزہ چکھ چکے ہیں، جنھوں نے صیاد کی مکاری کو تاڑ لیا ہے اور اس کے پر فریب مگر بظاہر حسین ارادوں کا مطالعہ کر لیا ہے ایلکسس کیرل اپنی کتاب 'انسان نامعلوم' (Man The Unknown) کے صفحہ ۱۲۴ پر لکھتا ہے:

''موجودہ تہذیب انسان کے عقلی اعمال کے لیے کوئی مناسب ماحول پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے، گری ہوئی اخلاقی و روحانی قدریں اکثر لوگوں کے روحانی نقائص کا سبب بن رہی ہیں کیوں کہ مادہ کی برتری اور صنعتی تہذیب کے اصولوں نے ثقافت اور اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔''

آگے ص ۳۳ پر مزید لکھتا ہے:

'' آج کا انسان موروثی ماحول اور زندگی کی ان عادات کا پروردہ ہے جو آج کے معاشرے نے اس پر فرض کی ہیں، ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ عادات کس طرح اس کے جسم اور شعور پر اثر انداز ہوتی ہیں، انسان اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق بنانے سے قاصر ہے اور جس کو آج کی ٹکنالوجی نے بنایا ہے اس ماحول نے انسان کو اباحیت پسند بنا دیا ہے، سائنس اور تکنالوجی کو موجودہ صورت حال کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ اصل ذمہ دار ہم خود ہیں، کیوں کہ ہم جائز و ناجائز میں امتیاز کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں، ہم نے قوانین طبیعت کی خلاف ورزی کر کے ایک بڑی غلطی کی ہے، اس غلطی پر ہمیشہ سزا ملتی ہے۔ جب انسان نے دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی کوشش

کی تو زندگی نے اسے کمزور بنا دیا، چنانچہ تہذیب روبہ زوال ہے۔"[۶]

امریکی فلسفی ول ڈیورانٹ اپنی کتاب "نیرنگی فلسفہ" میں کہتا ہے:

"ہماری آج کی ثقافت سطحی اور ہمارا علم خطرناک ہے، ہمارے پاس آلات اور مشینیں تو بہت ہیں مگر مقاصد کا فقدان ہے، توازن عقل جو پہلے مذہب کی ایمانی حرارت سے پیدا ہوتا تھا، اب ختم ہو رہا ہے اور سائنس نے ہم سے بلند اخلاقی اصول چھین لیے ہیں، ساری دنیا ایک عجیب انفرادی اضطراب کا شکار ہے جو درحقیقت ہماری اخلاقی پراگندگی کا آئینہ دار ہے۔"

ص ۱۳۴ پر لکھتا ہے:

"غالب گمان یہ ہے کہ لذت پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان نے مذہبی عقائد پر حملہ آور ہونے میں ڈارون کی بڑی مدد کی ہے، جب نوجوان نے یہ محسوس کیا کہ سائنس ان کی لذتوں کو برا خیال کرتا ہے تو انہوں نے بھی سائنس کی مدد سے مذہب کی برائی کے لیے ہزاروں اسباب ڈھونڈ نکالے۔"[۷]

انحرافِ مغرب کے ذمہ دار

مغرب جس انحراف سے دوچار ہوا اگرچہ اس کے سارے اسباب و عوامل پہلے سے موجود تھے اور یہ اجتماعی اقتصادی اور نظریاتی عوامل اپنی جگہ پر سخت ترین عوامل تھے جو نظریہ ڈارون اور صنعتی انقلاب کی شکل میں سامنے آئے مگر پھر بھی مذہب و اخلاق کی بالکلیہ تباہی ان عوامل کا نتیجہ نہ تھی۔

اس تباہی میں مارکس ڈرکایم اور بالخصوص فرائڈ کا سب سے زیادہ حصہ ہے، انہوں نے اپنے گمراہ کن افکار و نظریات کے ثبوت میں علمی دلائل کا سہارا لیا اور انہیں مزین کر کے عوام کے سامنے پیش کیا، مارکس اور ڈرکایم سے صرف نظر کر کے ہم اس وقت صرف افکار فرائڈ سے بحث کرنا چاہتے ہیں کہ ان افکار کی زد براہِ راست اخلاق پر پڑتی ہے اور فرائڈ نے بلاخوفِ تردید جنسی

آزادی کا سبق پڑھا کر اخلاق و مذہب سے لوگوں کو دور کر دیا ہے۔

فرائڈ کے حالات زندگی

قرآن کریم نے یہودی ذہنیت کی نقاب کشائی صدیوں پہلے کر دی تھی:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ـ وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ـ (النساء: ۱۶۰-۱۶۱)

''غرض ان یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویہ کی بنا پر اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں، ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

یعنی وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بیباک مجرم بن چکے ہیں کہ دنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک بھی اٹھتی ہے اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے، انسانیت کو بہکانے اور راہ راست سے ہٹانے میں یہی لوگ پیش پیش رہتے ہیں اور راہِ حق کی طرف بلانے کے لے جو تحریک بھی شروع ہوتی ہے اکثر اس کے مقابلے میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں، درانحالیکہ یہ کمبخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاء کے وارث ہیں ان کا تازہ ترین جرم یہ اشترا کی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے اسے پروان چڑھایا، ان نام نہاد اہل کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظام زندگی اور نظام حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کھلم کھلا دشمنی پر خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم و

ارادہ پر تعمیر کیا گیا، اس کے موجد ومخترع اور بانی وسربراہ کار موسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہوں۔

اشتراکیت کے بعد دور جدید میں گمرہی کا دوسرا بڑا ستون فرائڈ کا فلسفہ ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد ہے۔[۸]

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud 1859-1939) آسٹریا کا یہودی النسل باشندہ فیر مبرگ میں پیدا ہوا، نازیوں نے جب ۱۹۳۷ء میں آسٹریا کا الحاق کر لیا تو اس نے انگلستان میں پناہ لی۔ ۱۸۸۱ء میں ویانا یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کی اور وہیں طبابت کا پیشہ اختیار کر لیا ۱۸۸۵ء تک پیرس میں رہ کر اس نے شارکت (Choroct) کے طریق علاج کا مطالعہ کیا، ویانا واپس آ کر اس نے ڈاکٹر جوزف بریور سے ایک اور طریق علاج سیکھا، ۱۸۹۰ میں اس نے تحلیل ذات (Self Analysis) کے طریق پر اپنے ہی لاشعور کی طاقتوں کا تجزیہ کرنا شروع کیا اور اپنے ہی خوابوں کی تحلیل و تعبیر بھی، اس زمانے میں اس نے اپنے زیر علاج مریضوں کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات کی بنا پر انسانی شخصیت کے بارے میں ایک جدید نظریے کی داغ بیل ڈالی۔

۱۹۰۰ء میں اس کتاب کی تعبیر خواب (Interpretation of Dreams) شائع ہوئی، ۱۹۰۴ء میں اس کی کتاب روز مرہ زندگی کی نفسیات (The Pshychology of Everyday Life) شائع ہوئی جس نے جدید و قدیم دنیا میں تہلکہ مچایا۔ فرائڈ جدید علم نفسیات کا بانی اور تحلیل نفسی کا موجد ہے۔[۹]

یہودیت کی تذلیل اور اس کا غلط ردّ عمل

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فرائڈ یہودی النسل تھا اور یہودی تمام دنیا میں علی العموم اور مسیحی دنیا میں بالخصوص ایک ناپسندیدہ اور مجبور اقلیت رہے ہیں، البتہ اسلامی حکومت میں جب تک یہودی رہے تمام انسانی حقوق سے مستفید ہوتے رہے، ہر قسم کی جائز و ناجائز اقتصادی

سرگرمیوں میں بلا روک ٹوک لگے رہے، مگر مسیحی دنیا میں صورت حال مختلف تھی، وہاں انہیں خوب خوب رسوا کیا گیا، سزائیں دی گئیں اور بلا جھجک علانیہ تحقیر کی گئی کبھی انہیں انسانی حقوق تک نہ دیے گئے، مگر جب دور جدید میں انہوں نے مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہا تو ان کی ساری ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ ہوگئیں، ان کی ہر طرح کی مدد کی گئی اور انہیں ہر قسم کی طاقت بہم پہنچائی گئی تاکہ وہ عالم اسلامی پر مسلط ہو جائیں اور اس طرح عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو موخر کیا جا سکے اور یہ سارا کام اسلام دشمن صلیبی جذبے کے تحت کیا گیا اور باوجودیکہ اہل مغرب مسیحیت سے بالکل دست بردار ہو چکے ہیں، مگر ان میں اسلام دشمنی کے جذبات آج تک سرد نہیں ہو سکے۔[۱] دور جدید میں بھی اسرائیل کے ساتھ امریکہ کی دلچسپی کتنی بڑھی ہوئی ہے اس کو جاننے کے لیے آپ اس رویے پر ایک نگاہ ڈالیں جو جون ۱۹۶۷ء کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جائنٹ چیف آف اسٹاف جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار لے گا لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے اور انہوں نے سی آئی اے کے چیف رچرڈ ہلمیس سے رپورٹ طلب کی، جب اس نے بھی وہیلر کے اندازوں کی توثیق کی تو جانسن صاحب نے روس سے رجوع کیا اور یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخلت نہ کرے گا اس کے بعد کہیں جا کر اسرائیل پر وحی نازل ہوئی کہ اب عرب ملکوں پر حملہ کر دینے کا مناسب وقت آ گیا ہے، اس پر بھی امریکہ کا چھٹا بحری بیڑا مصر و اسرائیل کے سواحل کے اپنی پوری طاقت کے ساتھ مستعد کھڑا تھا تاکہ بوقت ضرورت کام آ سکے۔

انگریزوں کی اسرائیل نوازی کا حال یہ تھا کہ ان کا ایک طیارہ بردار بحری جہاز مالٹا میں اور دوسرا عدن میں ایک منٹ کے نوٹس پر اسرائیل کی مدد کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا، جنگ کے بعد لندن سنڈے ٹائمز نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (The Holy War June

(1967اس کا جو باب بیت المقدس میں یہودی قبضے کے بیان میں ہے اس کا عنوان رکھا گیا ہے Back After 896 Years یعنی "۸۹۶ برس کے بعد واپسی" اب یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے بیت المقدس پر صلیبی عیسائیوں کا قبضہ تھا نہ کہ یہودیوں کا، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی میں صلیبی جذبہ کام کر رہا تھا اور اس جنگ کو وہ صلیبی جنگوں کا ہی ایک حصے سمجھتے تھے۔[11]

لیکن مسیحیوں کی یہودیوں سے ہمدردی وغم خواری کا سبب کوئی انسانی جذبہ نہیں بلکہ مسیحیوں کے اپنے مکروہ مفادات اس کے پس پشت کام کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسی امریکہ میں بعض مقامات پر یہ بورڈ لگے ہوئے ہیں: "کتوں اور یہودیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

یہودی سرمایہ دار جو دوسری عالمی جنگ سے پہلے جرمنی اور دوسرے یوروپی ممالک کی معاشیات پر پوری طرح قابض ہو گئے تھے، ہٹلر نے اس کا بغور مطالعہ کیا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ یہودیوں کے اقتصادی غلبہ کی وجہ سود ہے، اگر سود کو قانونی طور پر ناجائز قرار دے دیا جائے تو یہودی سرمایہ داری بالکل ختم ہو جائے گی، مگر اس کا بڑھا ہوا انتقامی جنون اقتصادی حل کے بجائے اسے فوجی حل کی طرف لے گیا اور اس نے نہ صرف جرمنی بلکہ سارے یورپ سے یہودیوں کے استیصال کے لیے تاریخ کی ہولناک ترین جنگ چھیڑ دی، دوسری عالمی جنگ کے بعد کچھ بچے کھچے یہودی امریکہ پہنچ گئے، پچھلے تیس برس میں اس قوم نے امریکہ کے سودی اداروں کو اپنے ہاتھ میں لے کر امریکہ کی اقتصادیات پر دوبارہ اسی طرح قبضہ کر لیا ہے، جس طرح اس سے پہلے یوروپ کی اقتصادیات پر قبضہ کیا تھا۔ چنانچہ نازی جرمنی کی طرح امریکہ میں بھی ان کے خلاف نفرت کا آغاز ہو چکا تھا، حتی کہ مبصرین پیش گوئی کر رہے ہیں کہ عجب نہیں کہ مستقبل میں امریکہ میں بھی ان کے خلاف کوئی ہٹلر پیدا ہو۔[12]

مسیحی دنیا کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی مسیحی کسی یہودی سے قرض لیتا تو ہاتھ سے نہ لیتا بلکہ یہودی کو اچھوت کی طرح دور کھڑا کر دیتا اور اسے حکم دیتا "روپیہ رکھ دے اور فوراً اے سور میری

نظروں سے دور ہوجا'' جب یہودی دور چلا جاتا تو مسیحی سردار آگے بڑھ کر وہ رقم اٹھالیتا جو اس نے یہودی سے قرض لی ہوتی۔

قدیم و جدید ادب اس قسم کی مثالوں سے بھڑا پڑا ہے جو انگریزوں کی یہودیوں سے شدید نفرت کا پتہ دیتی ہیں اور جن سے ان کی حقارت اور کراہت کا اظہار ہوتا ہے، جیسے مشہور ناول "Scarlet Pimpernal" اور شیکسپیئر کا ڈرامہ "Merchant of Venice" وغیرہ۔[۱۳]

یہ وہ چیزیں تھیں جسے یہودی ذہن فراموش نہ کرسکا، چنانچہ جب ڈارون کی کتاب اصل الانواع شائع ہوئی جن میں انسانی تصویر مادہ کی صورت میں دکھائی گئی تو اسے بھی یہودیوں نے اپنی فتح سمجھا اور ''علمائے یہود کے نظم عمل'' "The Protocols of the Learned Jews" میں واضح لفظوں میں کہا گیا کہ ''ڈارون اگرچہ یہودی نہیں ہے مگر اس کی آراء کی وسیع پیمانے پر اشاعت کرکے ہم مسیحی مذہب کی تباہی کا کام لے سکتے ہیں۔

اسی کتاب کے دوسرے صفحہ پر رقم ہے:

> ''اگر ہم یہودی ہر مقام پر اخلاقی انحطاط کی کوشش کرتے رہیں تو ہمارا غلبہ آسان ہوجائے گا۔ فرائڈ ہم میں سے ہے اور وہ جنسی تعلقات کو علانیہ پیش کرتا رہے گا، تاکہ نوجوان نسل کی نظر میں کوئی شئے مقدس نہ ہے اور وہ اپنی جنسی بھوک مٹانے میں لگ جائے، یہی طریقہ اخلاق کے زوال کا ہے۔''

یہودیوں کے بارے میں عام طور سے مشہور ہے کہ وہ مفاد پرست اور حرص و ہوس کے غلام ہوتے ہیں، اپنے مفاد کے لیے پوری اجتماعیت کو قربان کردیتے ہیں، ان کے نزدیک اقدار عالیہ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، وہ معمولی سی معمولی فائدہ کی خاطر خسیس ترین حرکتیں کرنے سے نہیں چوکتے بخالت، ذخیرہ اندوزی اور احتکار میں ان کی مثال بیان کی جاتی ہے۔

انتقامی کارروائی

ظاہر ہے کہ فرائڈ بچپن سے یہ تمام باتیں سنتا آرہا تھا اور یہودیوں پر جبر و ظلم کی داستانیں اس کے احساسات پر اثر انداز ہو رہی تھیں کیوں کہ وہ خود یہودی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور یہودیوں پر اٹھنے والی حقارت آمیز نظریں خود اسے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، یہی احساسات اس کے لاشعور میں مرتکز ہو گئے اور اس کے لاشعور نے مسیحی ظالم و جابر لوگوں سے معقول اور بظاہر بے ضرر سا انتقام لے لیا۔

اس نے اپنا اور تمام یہودیوں کا انتقام لیتے ہوئے کہا:

> ''اے لوگو! تم ہمارے بارے میں کہتے ہو کہ ہم اپنی جبلتوں کی خاطر زندہ ہیں، ہم مفاد پرست ہیں اور ہم اخلاقی اقدار کے منکر ہیں، تم بتاؤ، تم کیا ہو؟ آؤ میں تمہیں ایسا آئینہ جہاں نما دکھاؤں، جس میں تمہارے نفس کی گہرائیاں تک سامنے آجائیں گی اور تمہارے لاشعور کی تاریک تہیں بھی روشن ہو جائیں گی، دیکھو! تم بھی یہودیوں جیسے ہو، تم بھی اپنی جبلتوں کی تکمیل کی خاطر زندہ ہو، تمہارا بھی کوئی ضمیر نہیں ہے، تم بھی اخلاق سے تہی داماں ہو، تم بھی معنوی قدروں سے بیزار ہو- جو بھیانک اور بدنما تصویر تم نے یہودیوں کی تیار کی ہے، وہ تمہارے اپنی ہی تصویر ہے، یہودیوں کو کیا کہتے ہو، ساری انسانیت ہمیشہ سے گندگیوں میں لتھڑی چلی آرہی ہے اور یہ تصویر صرف ہماری نہیں ساری انسانیت کی تصویر ہے۔''[۱۴]

اس طرح فرائڈ نے لاشعوری طور پر ساری انسانیت کو گندگیوں میں لتھیڑ کر یہودیوں کے مماثل ٹھہرا دیا اور ساری خرابیاں جو یہودیت کے ساتھ خاص تھیں ساری انسانیت کے دامن میں الٹ دیں، اس طرح اس نے پوری یہودی قوم کی طرف سے زبردست انتقام لیا، ایسا انتقام جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ فکر و عمل کے زاویے بدل کر، اخلاق و کردار کے معیار بدل کر اور شرافت و فضیلت کی کسوٹی متغیر کر کے اس نے پوری دنیا سے اپنی توہینوں کا بدلہ لے لیا۔

فرائڈ کے رہنما اصول

نظریہ فرائڈ پر بحث کرنے سے پہلے اس کے چند اصول رہبر کا جان لینا ضروری ہے تا کہ اس نظریہ کو مکمل طور سے سمجھ سکیں۔

۱۔ جس چیز کی ممانعت ہے اس کی خواہش ہونی چاہیے یعنی اگر لوگوں نے ایک چیز کے کرنے کی خواہش نہ کی ہوتی تو اس کے خلاف قانون اور رواج میں رکاوٹ کبھی نہ ہو سکتی تھی۔

اس اصول کے مطابق جس چیز کی جس قدر سختی سے ممانعت ہے اس کا اسی قدر زیادہ سختی سے خواہش بھی ہونی چاہیے، چنانچہ اپنے باپ کو مار ڈالنا محرمات سے شادی کرنا اور قریبی اعزہ میں جنسی تعلقات وغیرہ خاص طور پر قابل نفرت فعل اور شدید جرم ہیں، ان سب کے ارتکاب کی اسی شدت کے ساتھ خواہش بھی ہونی چاہیے کہ جس کے روکنے کے لیے معاشرہ کو شدید مذمت اور سزا کی ضرورت پڑی ہے۔

۲۔ جس چیز کا خوف ہوتا ہے غالباً اسی کی خواہش بھی ہوتی ہے اور خوف دراصل خواہش کا نقاب ہوتا ہے، یعنی زندہ میں جو خوف پایا جاتا ہے وہ اکثر عجیب وغریب ہوتا ہے اور فرائڈ کو اس پر نا قابل قبول خواہشوں کے پردہ پوش ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

۳۔ کسی شخص کی عافیت سے متعلق غیر معمولی پریشانی ممکن ہے، اس کو مضرت پہنچانے کی غیر شعوری خواہش کا نقاب ہو اور یہ پریشانی اس خواہش پر پردہ ڈالے ہوئے ہو۔

انسان فرائڈ کی نظر میں

فرائڈ کی نظر میں انسان کی نفسیاتی ساخت کے تین درجات ہیں:

پہلا درجہ شہوانی قوت (Libido) ہے، جس کا مرکز ذات سفلی ہے۔ (ماہرین تحلیل نفسی یہ لفظ لاشعوری ذہن کے لیے استعمال کرتے ہیں، جس میں انسان کی دبی ہوئی خواہشات پڑی رہتی ہیں۔) یہ بنیادی طور پر جنسی قوت ہے، اگر چہ ذات سفلی ایک بالمقابل قوت پر مشتمل ہے جس

کا کوئی معین عنوان تو نہیں ہے، مگر وہ قطعی طور پر اپنے مالک کے تصرف میں ہوتی ہے۔

دوسرا درجہ ذات انا (Ego) کا ہے جو دراصل شعور ہے، جو معاشرے سے برتاؤ کرتا اور نفس کی متناقض خواہشوں اور مادی وخارجی حقیقت کے درمیان ربط وہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔

اور تیسرا درجہ اعلیٰ ذات (Supper Ego) کا ہے (ذات اعلیٰ ایگو کا وہ حصہ ہے، جس نے امتناعی وتعزیری کارکردگی کو اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور جس کا کام خارجی دنیا میں اپنے والدین اور ارباب اقتدار سے ملتا جلتا ہے اس کی کارگذاریاں بیشتر لاشعوری ہوتی ہیں، جب ہم اس سے آگاہ ہوجاتے ہیں تو اسے ضمیر کہتے ہیں، بچے کے چہرے پر تہدید آمیز رویہ کے جو اثرات موجود ہوتے ہیں ان کے ساتھ بچہ نفرت اور عداوت کے وہ میلانات بھی شامل کر لیتا ہے، جو بچے عام طور سے اپنی من مانی باتوں سے روکنے والوں کی طرف محسوس کرتے ہیں اس طرح تہدید آمیز رویہ کے اثرات اور نفرت وعداوت کے میلانات مل کر سب انا کے خلاف صف آرا ہوجاتے ہیں، یوں ذات اعلیٰ ماں باپ اور دیگر ارباب اقتدار سے بھی ایک بڑا ہوا بن جاتی ہے اور سپرا ئیگوا یڈ سے اپنے تعلقات کی بنا پر انسان کو اپنی جنسی ناکامیوں، ذہنی الجھنوں اور دیگر پریشانیوں سے سزا دیتی ہے، بیماریوں اور حادثوں کا سبب بنتی ہے، فرائڈ کے نزدیک یہ ایڈپس الجھن کا نتیجہ ہے، جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بچہ اپنے باپ کی شخصیت کی نقل کرتا ہے اور اسی سے عشق مادر کی الجھن پیدا ہوتی ہے، جو بچہ کی ماں سے جنسی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ باپ بچہ کی اس خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ بنتا ہے، جس سے بچے کے شعور میں محبت ونفرت بیک وقت جاگزیں ہوجاتے ہیں، پھر بچہ اس کشمکش سے اس طرح پیچھا چھڑاتا ہے کہ وہ طبعی طور پر اپنے باپ کی شخصیت کی زیادہ سے زیادہ نقل کرتا جاتا ہے، اسی الجھن سے ضمیر پیدا ہوتا ہے جو اپنی ناموافق جنسی خواہشوں کو دباتا اور لچکتا ہے، تاکہ ذاتِ انا کو باپ، معاشرہ، مذہب اور روایات کے بیرونی تسلط اور اس کی زیادتیوں سے محفوظ رکھ سکے۔ [۱۵]

لاشعور کے بارے میں فرائڈ بلا کسی لاگ لپیٹ کے کہتا ہے:

''لاشعور ابلتی ہوئی خواہش کی ایک دیگ ہے، اس کے اندر کوئی نظم اور کوئی سوچا سمجھا ہوا ارادہ نہیں، صرف لذت کی خاطر جنسی خواہشات کی تکمیل کا جذبہ ہے، منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول بھی لاشعور کے عمل پر حاوی نہیں ہوتے، مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کیے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں، لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو، اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فلسفی کا یہ دعویٰ کہ وقت اور فاصلہ ہمارے افعال کے لازمی عناصر ہیں، لاشعور کی دنیا میں غلط ہو جاتا ہے، لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے علاقہ رکھتی ہو، لاشعور میں وقت کے گذرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت کے گذرنے سے لاشعور کے عمل میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، ایسی خواہشات عمل جو لاشعور سے کبھی باہر نہیں آئیں، بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنہیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو لاشعور میں ہر لحاظ سے غیر فانی ہوتے ہیں اور سالہا سال تک اس طرح سے محفوظ رہتے ہیں گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں۔''[۱۶]

مذہب واخلاق فرائڈ کی نظر میں

فرائڈ کے خیال میں مذہب ایک بدترین جرم کی پیداوار ہے وہ اس طرح کہ انسانیت اولیٰ کی کسی نسل میں بیٹوں نے اپنی ماں میں زبردست جنسی کشش محسوس کی مگر باپ، کا اقتدار اس گناہ کے راستے میں رکاوٹ بن گیا، اس پر اولاد نے یہ سازش کی کہ باپ کو قتل کر کے راستے سے ہٹا دیا جائے اور اس طرح ماں کو حاصل کر لیا جائے، چنانچہ ایک دن انہوں نے اپنی اس سازش کو عملی جامہ پہنا دیا، مگر فوراً ہی انہیں شرمندگی محسوس ہوئی اور احساس گناہ ان پر غالب آ گیا اس لیے انہوں نے عزم کیا کہ اپنے مردہ باپ کی یاد منائیں گے۔ اور اس کی مقدس یاد منانے کی خاطر یہ

کچھ جانوروں کو مقدس قرار دے کر ان کا مارنا حرام قرار دے دیا، اسی سے دنیا کے اولین مذہب طوطمیت[۱۷] (Totemism) نے جنم لیا، اور اس کے بعد جس قدر مذاہب آئے ہیں وہ دراصل اسی احساس جرم کے مسئلے کا حل پیش کرتے ہیں، اگرچہ یہ مذاہب تہذیبی اختلاف اور اپنے وسائل کے فرق کی بنا پر مختلف ہوتے ہیں، مگر ان سب کا اصل ہدف ایک ہی ہوتا ہے، یعنی باپ کے قتل کے عظیم واقعہ کا ردعمل، جس نے آج تک انسانیت کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا اور جو تنہا تمام تہذیبوں کا سرچشمہ ہے۔[۱۸]

مذہب کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بچہ بڑا ہو کر سمجھنے لگتا ہے کہ اب اس کے والدین اس کی حفاظت اور پرورش و پرداخت کرنے سے قاصر ہیں تو وہ ایک آسمانی باپ کی خواہش پیدا کر لیتا ہے اور پھر وہ باپ اصلی باپ کی جگہ حکم و احکام کا سلسلہ جاری کرتا ہے، یا عام زندگی میں امن و سکون کی حالت اس وقت تک نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ انسان اپنی خواہشات کو دوسروں کے لیے قربان نہ کرے اور یہ ایثار و قربانی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک انسان کے سامنے اس کا کوئی معاوضہ نہ ہو، لیکن چونکہ دنیا میں کوئی حقیقی معاوضہ کی صورت نہ تھی اس لیے انسان نے خدا نام کے خیالی معاوضہ کی شکل تجویز کی، پھر خیالی معاوضہ ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا مذہب کی موجودہ صورت کو پہنچا۔[۱۹]

وہ کہتا ہے:

> ”مذہب زندگی کی امنگ کو کچل ڈالتا ہے کیوں کہ مذہب کا سرچشمہ بدوی اور غیر مہذب دور کے لوگوں کی من گھڑت کہانی ہے، مگر اب چونکہ سائنس وجود میں آ چکی ہے اور انسانیت کی بہترین راہ نما بن چکی ہے، اس لیے سائنس نے مذہب کی جگہ لے لی ہے، اس لیے مذہب کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔“

اصول اخلاق دراصل سماج کی پیدا کی ہوئی ایک مصنوعی رکاوٹ ہیں تاکہ انسان کی جنسی خواہشات بے لگام ہو کر اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں:

''ضمیر سماج کا پولیس مین ہے، جو انسان کے شعور میں پہرہ دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے، نیک و بد کی تمیز محض فرضی ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔''[۲۰]

وہ کہتا ہے:

''پاگل، من چلے، ہسٹریا کے مریض، مرگی زدہ، ایسے مجنوں جن کے دماغ کے عضویاتی عمل میں کوئی خرابی نہیں ہے، عدالتی کٹہرے اور پھانسی کے تختے کی جانب جانے والے مجرم، سب لوگ ایسے ہیں جو مذہب اور خلش ضمیر کی قربان گاہوں پر نثار ہو گئے اور جو ان رکاوٹوں کی نذر ہو گئے جو فرد کے راستے میں کھڑی کر دی گئی ہیں، جو اس کی جبلتوں کو کچل ڈالتی ہیں، اس کے وجود کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں اور اس کی زندگی کی امنگ کو مرجھا دیتی ہیں، ان اعصابی اضطراب سے چھٹکارا پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ فرد کے راستے سے یہ تمام نقصان دہ رکاوٹیں ہٹا دی جائیں اور اس کے کچلے ہوئے جذبات کو روایات کے قید خانے سے آزاد کرایا جائے۔''

اپنی کتاب "Three Contributions to the Sexual Theory" میں رفعت یا تصعید (لاشعور کا وہ طرز عمل جس کے تحت جنسی جذبہ یا جنسی توانائی کسی غیر جنسی دلچسپی میں تبدیل ہو کر سوسائٹی کے لیے قابل قبول ہو جائے) کے زیر عنوان ص ۸۲ پر لکھتا ہے:

''جنسی کجروی Sexual Perversion کی تیسری قسم وہ ہے جس کے نتیجہ میں رفعت کا عمل ابھرتا ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں فرد کے جنسی سرچشموں سے ابلنے والی شہوانی قوت کو جنس کے علاوہ دیگر امور میں کھپا دیا جاتا ہے۔ اور وہاں اس قوت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔''

The Ego and Id کے ص ۸۰ پر واضح لفظوں میں کہتا ہے:

''اخلاق خواہ اپنے طبعی اور معمولی درجے ہی میں کیوں نہ ہو مگر اس پر سماجی جبر کے اثرات مرتسم ہوتے ہیں۔''

نظریۂ فرائڈ کی خامیاں

ماہرین نفسیات نے نظریۂ فرائڈ کی بہت سی خامیاں اور کمزوریاں بیان کی ہیں، حتیٰ کہ فرائڈ کی نفسیات کا تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ خود جنسی خواہشات کا غلام تھا اس لیے ہر چیز کو وہ جنسیت ہی کی نگاہ سے دیکھتا تھا، فرائڈ نے لاشعور میں تمام تر جنسی نوعیت ہی کی کارفرمائیوں کو تسلیم کیا ہے، اگر ہم اسے درست قرار دے لیں تو پھر تو جنسی خواہشات کی تکمیل سے کامل انشراح اور آسودگی حاصل ہونی چاہیے۔ حالانکہ تجربہ اس کے برخلاف ہو رہا ہے، امریکہ میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی کی کوئی انتہا نظر نہیں آتی، اب عورتوں سے جنسی خواہشات کی تکمیل کرنے کے بجائے مردوں اور بچوں سے کی جارہی ہے، اور حسین بچوں کے قحبہ خانے کھل رہے ہیں، اور اس پر ''ہل من مزید'' کا نعرہ لگایا جارہا ہے۔

فرائڈ کا یہ نظریہ بالکل ہی غلط ہے کہ آزادانہ میل جول خیالات کو مہذب بناتا ہے، دبی ہوئی طاقتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور دونوں فریق کو آدابِ معاشرت سکھاتا ہے، کھلی ٹانگیں مسلسل دیکھتے رہنے سے آدمی کی جنسی بھوک مٹ جاتی ہے۔ صنفی خواہشات سرد پڑ جاتی ہیں اور اس طرح کامل تجربے کے بعد جو شریک زندگی کا انتخاب کیا جاتا ہے، وہ محبت واخوت کا ضامن اور تعلقات کی استواری کا کفیل ہوتا ہے۔

طویل تجربے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آزادانہ اختلاط کی بدولت خاوند یا بیوی کی زندگی میں کسی زیادہ طاقت ور، ہمہ گیر، حسین وجمیل اور جاذب شخصیت کا ابھر آنا عین ممکن ہوتا ہے اور پھر کسی ایک کے پھسل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اور اگر فرائض زوجیت کو بچانے کی خاطر وہ اس جذبے کا مقابلہ کرے تو اضطراب و بے چینی کا شکار ہو کر اخفاء میں مبتلا ہو جاتا ہے، دونوں ہی صورتوں میں اطمینان قلب غارت، خاندانی سکون ختم اور خانگی امن برباد ہو جاتا ہے، پھر انسانیت کا بدکاری و بے حیائی میں ملوث ہو جانا، اور اخلاق واقدار سے گریز کرنا اور حیوانی صفات سے اپنے کو مزین کرنا ستم بالائے ستم ہے۔

جہاں تک آزادانہ اختلاط سے فریقین کے درمیان محبت وشائستگی کے پیدا ہونے کا سوال ہے تو یہ بالکل ہی لغو ہے، اس کا نتیجہ سوائے ناجائز مباشرت اور اسقاط حمل کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے ایک جائزے کے مطابق اسپتالوں میں اسقاط حمل کرانے والوں میں ۱۰۰ فیصدی کنواری لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ جائزہ کے مطابق حمل گرنے والوں میں بیشتر اسکولوں یا کالجوں کی پڑھنے والی طالبات ہوتی ہیں، جو تیس روپیہ ماہوار سے ۱۵۰ روپیہ ماہوار تک آمدنی رکھنے والے خاندانوں سے متعلق ہوتی ہیں۔

امریکہ میں ہائی اسکولوں میں حاملہ لڑکیوں کی تعداد تو چند سالوں تک ۴۸ فیصد تک پہنچ چکی تھی اور اب دن بدن اس میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، یہاں تک کہ مشہور مصنف جارج اسکاٹ اپنی تصنیف ''فحبہ گری کی تاریخ'' (The History of Prostitutes) میں لکھتا ہے:

> ''تاریخ عالم کے کسی دور میں آج سے پہلے معزز گھرانوں کی لڑکیوں کی اتنی کثیر تعداد جنسی خواہشات کی تسکین میں کبھی اتنی پیش نہ تھی، یہ صورت حال امریکہ اور یوروپ کے ہر شہر میں موجود ہے، جہاں لڑکیاں بہر وجوہ مردوں سے ازدواج کے بغیر اختلاط پیدا کرتی ہیں، آجکل نوجوان لڑکیاں اس وقت تک شادی کا خیال نہیں کرتیں جب تک وہ خوب گلچھرے اڑا کر تھک نہیں جاتیں۔''

پروفیسر سارنس اپنی مشہور کتاب (Love and Marriage) ''محبت اور شادی'' میں لکھتا ہے:

> ''جنسی آزادگی نے دوشیزگی اور عفت مآبی کا قلع قمع کر دیا ہے، شادی سے قبل کسی لڑکی کا باکرہ رہنا اب ممکن ہی نہیں رہا، سوسائٹی میں خود اس چیز کی کوئی اہمیت نہ رہی۔''

جدید دنیا میں آزادانہ میل جول اور کامل تجربے کے بعد نکاح کرنے والے خوش قسمت گھرانوں سے یہ بھی دریافت کرنا چاہیے کہ ان میں سے طلاق سے برباد ہونے والوں کا تناسب کیا ہے؟ قومی آواز کی ۴/ اگست ۱۹۷۷ء کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ طلاق،

دنیا کے سب سے زیادہ جدید اور مہذب ملک امریکہ میں دی جاتی ہے، ۱۹۷۴ء میں امریکہ میں ایک لاکھ پچیس ہزار طلاق لینے یا دینے کے واقعات ہوئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ 4.6 فیصد افراد وہاں طلاق شدہ ہیں، امریکہ کے بعد ایک امریکہ جزیرے پورٹوریکو کا نمبر آتا ہے، جہاں 3.8 فی ہزار طلاق ہوتی ہے، سوئیڈن، روس، کیوبا، ڈنمارک اور مغربی جرمنی و مشرقی جرمنی کا نمبر بعد میں آتا ہے۔

۸/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو برطانوی ہائی کورٹ کے جج مسٹر جارج بیکر نے خاتون سوسائٹی میں کہا کہ میرا اندازہ ہے کہ اس سال ایک لاکھ اسی ہزار طلاقیں ہوں گی، یعنی ہر دو شادیوں میں سے ایک کا انجام طلاق ہوگا۔

یہ تو طلاق کے مارے ہوئے گھروں کا حال تھا، آزادانہ اختلاط سے بے قید شہوتوں، صبح شام بدلنے والی خواہشات اور باطنی قلق و اضطراب کا ظہور ہوتا ہے، اس معاشرے میں ہر نیا رفیق حیات یا جیون ساتھی یا بوائے فرینڈ ان شہوتوں کو بھڑکا سکتا ہے، اور نتیجتاً مرد اور عورتیں دونوں ہر نئے شکار کے ساتھ کھسک سکتی ہیں، زوجین میں بجائے استواری اور استحکام پیدا ہونے کے انقطاع اور ممکن انقطاع پیدا ہوجاتا ہے، جب کوئی مرد یا عورت کسی نئی شخصیت میں کوئی نئی لچک دیکھتی ہے تو خانگی زندگی آندھیوں کی زد میں آجاتی ہے، اور دونوں میں دائمی تفریق ہوجاتی ہے، اسی سلسلہ کی مغربی جرمنی کی ایک دلچسپ خبر یہ ہے کہ ایک آفس منیجر، آفس کی چابی گھر بھول گیا، چابی لینے وہ گھر پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس کے گھر کی کھڑکیاں ابھی تک بند پڑی تھیں، وہ دروازے سے گذرتا ہوا باورچی خانے پہنچا، تو اس نے دیکھا کہ اس کی ۱۶ سالہ حسین ترین بیوی پوری طرح برہنہ، انڈے اور مچھلیاں تل رہی ہے اور اس کے پاس ہی ایک نوجوان بھی ٹھیک اسی حالت میں برہنہ اسٹول پر بیٹھا ہے، یہ منظر دیکھ کر وہ مشتعل ہوگیا اور غصہ میں اس نے اپنی بیوی کو اٹھا کر اس فرائی پان میں بٹھا دیا جس میں انڈے تلے جارہے تھے، اس نوجوان کو وہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا، مزید تماشا یہ کہ پولیس نے شوہر پر الزام لگایا کہ

اس نے اپنی بیوی کو سخت جسمانی تکلیف پہنچائی ہے۔

تہذیب جدید کا یہ تجربہ فرائڈ کی کھلی تکذیب کرتا ہے وہ ارباب عقل ونظر کو چیخ چیخ کر بتارہا ہے کہ اختلاط مرد وزن کا نتیجہ صرف دائمی اشتعال ہے، تم اس سے محبت واخوت باہمی تعامل و تعاون، جنسی بھوک کو دبا دینے اور تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے فوائد حاصل نہیں کر سکتے۔ جسمانی خواہشات اتنی گہری ہوتی ہیں کہ اختلاط مرد وزن بلکہ فریقین کے باہم سیر ہو جانے کی آزادی بھی انہیں نہیں بجھا سکتی۔ تم معدے کی بھوک کو صرف بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے نہیں مٹا سکتے، بلکہ وہ بھوک کی شدت میں اور اضافہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح تم اسے بدہضمی پیدا کرنے والی مرغن غذاؤں سے بھی صرف ایک محدود مدت تک ہی مٹا سکو گے اس کے بعد جب دوبارہ اس کی طلب ہوگی تو پہلی طلب سے شدید تر ہوگی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعلان تجربات بہانگ دہل کر رہے ہیں۔

پھر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ بچہ کا انگوٹھا چوسنا، چیزوں کو کاٹنا، منہ میں رکھنا، پاخانہ پیشاب کرنا، چیزوں کی طرف دیکھنا، منہ پھیر لینا، ٹانگوں اور ہاتھوں کی حرکات وغیرہ سب میں جنسی جذبہ کی کارفرمائی مان لی جائے۔

پھر یہ بھی سوچیے کہ سماج کی خدمت کرنے والے رشی، ضلالت کو ختم کر کے ہدایت کی روشنی پھیلانے والے انبیاء ورسل، گمراہیوں کے خلاف سر بکف مصلحین واتقیاء اور قوم وملت کی خاطر جان دینے والے شہداء، کیا ان سب کی کارگزاریاں محض جنسی جذبے کی انگیخت کا نتیجہ ہیں؟ کیا یہ بلند اخلاق وکردار کے مالک انسان محض جنسی خواہش کی تکمیل کا سامان کرتے رہے؟

پھر فرائڈ کہتا ہے کہ اخلاق پر سماجی اثرات بہرحال مرتسم ہوتے ہیں، اگر اس نظریہ کو درست مان لیا جائے تو آخر صحابۂ کرامؓ کے ایمان لانے کے زہرہ گداز واقعات، جاں گسل مصائب ومشکلات پر ان کا صبر اور دین کی خاطر ان کی جدوجہد کی کیا تاویل کی جائے گی؟ اس وقت جبکہ آنحضور ﷺ کی دعوت پوری طرح پھیلی بھی نہیں تھی، کوئی ان کی دعوت کا کوئی ہم نوا نہ تھا، آپ

کے پیچھے کسی قسم کی سیاسی و دینی سیادت کی قوت نہ تھی، صحابۂ کرام آپ پر ایمان لائے اور تن من دھن سے اس کی اشاعت میں لگ گئے، تمام مصائب کو خود ہی دعوت دی، اور حوادث کے تھپیڑے کھا کر بھی دین پر ثابت قدم رہے۔ آخر صحابہؓ کے اس فعل میں کس قسم کے جبر کو دخل تھا؟ کون انہیں ایمان لانے اور مصائب کو دعوت دینے پر مجبور کر رہا تھا؟

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنے خطبہ میں بیان فرمایا تھا:

أمّا بعد أيّها النّاسُ فإنّي ولّيتُ عليكم ولستُ بخيرِكم فإنْ أحسنتُ فأعينوني، وإنْ اسأتُ فقوّموني، الصدقُ أمانةٌ، والكذبُ خيانة، الضعيف فيكم قويٌّ عندي حتى أريح عليه حقّهُ إن شاء الله تعالىٰ، والقويُّ فيكم ضعيفٌ عندي حتى آخذ منهم الحق إن شاء الله تعالىٰ، لا يدع قوم الجهادَ في سبيل الله إلّا ضربهم اللّهُ بالذّل، ولا تشيع الفاحشةُ في قومٍ قطُّ إلّا عمّهم الله بالبلاء أطيعوني ما أطعتُ الله ورسوله، فإن عصيتُ الله وَرسولَهُ فلا طاعةَ لي عليكم قوموا إلىٰ صلوتكم يرحمكم اللّهُ۔ [۲۱]

''اے لوگو! مجھے تمہارے اوپر نگراں بنایا گیا ہے حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرو، اور اگر میں غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کردو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ بولنا خیانت ہے۔ تمہارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک طاقتور ہے تا آنکہ میں اللہ کی اجازت سے اُسے اس کا حق واپس دلا دوں۔ اور جو تمہارے درمیان طاقت ور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے تا آنکہ اللہ کے اذن سے میں اُس سے حق وصول کرلوں۔ اگر کوئی قوم اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چھوڑ دیتی ہے تو اسے اللہ ذلیل کر دیتا ہے۔ اور کسی قوم میں جب بھی بدکاری عام ہو جاتی ہے اللہ اس پر آفت مسلط کر دیتا ہے۔ میری بات مانو جب تک میں اللہ اور اس کے

رسول کی اطاعت کروں۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے لگوں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔ اللہ تم پر رحم کرے، تم لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔"

خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ایک خطبہ میں اپنے منصب کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

إنّی امرؤٌ مسلمٌ وعبدٌ ضعیفٌ إلّا ما أعان اللّٰهُ عزّوجلّ، ولن یغیّرالذی ولّیتُ من خلافتکم من خُلقی شیئًا إن شاء اللّٰهُ، إنّما العظمة للّٰه عزّوجلّ، ولیس للعباد منهاشیٌ۔ فلا یقولنّ أحدُکم إنّ عمر تغیّر منذوُلّی، أعقل الحق من نفسی، وأتقدّم وأبیّنُ لکم أمری، فأیّما رجلٌ کانت لهٗ حاجةٌ أوظُلم مظلمة أوعتب علینا فی خُلق فلیُؤذِنّی، فإنّما أنا رجلٌ منکم۔ [۲۲]

"میں ایک عام مسلمان اور ایک کمزور بندہ ہوں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مدد کرے۔ مجھے تمہاری خلافت کی جو ذمہ داری عطا کی گئی ہے وہ اللہ نے چاہا تو میرے اخلاق کو خراب نہیں کر سکتی۔ بڑائی صرف اللہ کو زیبا ہے، بندوں کو کوئی بڑائی حاصل نہیں ہے۔ تم میں سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے گا کہ خلافت ملنے کے بعد عمر بدل گیا ہے۔ میں اپنے نفس سے بدلہ لینے کے لیے تیار ہوں۔ میں ہمیشہ آگے بڑھ کر اپنے معاملے کی صفائی تمہارے سامنے دیتا رہوں گا۔ اگر کسی شخص کو کوئی حاجت ہو، یا اس کی حق تلفی ہوئی ہو، یا میرے اخلاق کے معاملہ میں کوئی چیز قابل گرفت نظر آتی ہو تو وہ مجھے اس کی طلاع دے، کیوں کہ میں تمہاری طرح کا ایک آدمی ہوں۔"

ماہرین نفسیات کی تنقید

نظریۂ جنسیت میں اسی قسم کی خامیوں اور بے ضابطگیوں کا نتیجہ تھا کہ فرائڈ اپنے دور کے

ماہرین نفسیات سے یہ نظریہ منوانہ سکا اور اس نے اس کی کھل کر تردید کی۔ چنانچہ میکڈوگل نے اپنی مشہور کتاب ' اساس نفسیات '' میں کتے کی مثال دے کر سمجھایا ہے کہ ایک کتا جو انتہائی سردی میں ٹھٹھرتا ہوتا ہے اور رات کی تاریکی میں کوئی اس کی نگہبانی کرنے والا نہیں ہوتا ہے، اتفاق سے کسی انسان کا ادھر سے گذر ہوتا ہے اور کتے کی حالت زار دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے پھر انتہائی محبت و ہمدردی کے عالم میں اس کو اپنے گھر لا کر زندگی بھر ہر طرح سے اس کی حفاظت و کفالت کرتا ہے اور مر جانے پر باقاعدہ اس کو دفن کرتا ہے، کیا اس کتے سے جو محبت و ہمدردی پیدا ہوئی اس میں بھی جنسی و شہوانی محبت کی کارفرمائی تھی؟ چنانچہ وہ کہتا ہے '' میں نے کتے کی مثال اس لیے لی ہے کہ اس سے فرائڈ کے اس عقیدہ کی تردید ہوتی ہے کہ ہر محبت بالضرور جنسی (شہوانی) جبلت کو شامل ہوتی ہے۔''

اسی طرح فرائڈ کا مشہور شاگرد الفریڈ ایڈلر اس نظریہ سے مطمئن نہ ہو سکا اور برابر اس کی مخالفت کرتا رہا حتیٰ کہ اپنے استاد کی رفاقت بھی ترک کر دی۔ ایڈلر نے فرائڈ کی غیر تسلی بخش نظریۂ لاشعور کی جگہ ' حب تفوق ' کا نظریہ ایجاد کیا کہ جذبہ لاشعور کی نوعیت، جنسی نہیں ہے بلکہ تفوق اور اس مخالف مذہب کا نام اس نے انفرادی نفسیات رکھا ہے۔

حتیٰ کہ فرائڈ سے لے کر اب تک نفسیات کے جو مختلف اسکول وجود میں آئے ہیں، وہ باہمی اختلافات کے باوجود اس مشترکہ کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ نفسیات کا کوئی اقدار سے آزاد علم (Value Free Science) وجود میں لائیں مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ ایک صدی کی مسلسل کوششوں کے باوجود وہ اس منزل تک پہنچنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اب ان کے درمیان ان کے خلاف ردّ عمل شروع ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کے مشہور ماہر نفسیات ابراہم میسلو (۱۹۰۸ - ۱۹۷۰ء) جو خود ثبوتی کرداریت (Positivistic Behavouristic Tradition) کے زیر سایہ تیار ہوا تھا، اپنی عمر کے آخر حصہ میں وہ انسانی فطرت کے دور تر گوشے (Farther Reaches of Human Nature) کی تلاش

میں مصروف ہو گیا Abraham Maslow کا کہنا ہے:

"Psysology had voluntarily restricted itself to only half of its rightfull jurisdiction."

''نفسیات نے اپنے جائز حدود کار کے نصف حصہ سے بطور خود اپنے آپ کو روک لیا ہے۔'' (الرسالہ، مئی ۱۹۷۶ء)

ہے وہی ساز کہن

جنہوں نے مغربی تہذیب کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے ان کی نگاہوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ آج مغربی قافلہ اسی راستہ پر چل رہا ہے جس پر کبھی رومی گذرے تھے۔ رومیوں نے یونانیوں کی اتباع کی تھی اور یونانیوں نے مصر، شام، روم، فلسطین اور دو آبہ قوموں کی اتباع کی۔ اور انہوں نے تاریخ سے پہلے کی قوموں کی اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر مہذب اور وحشی انسانوں نے زندگی کی شاہراہ بنائی اور ان کے چھوڑے ہوئے تمدنی سرمایہ کے ساتھ سامی اقوام اسی شاہراہ پر چلتی رہیں، پھر سوجری قوم اسی راستہ پر چلی۔ ہر قوم کچھ نہ کچھ تبدیلی اور اضافہ کے ساتھ اسی راستہ پر بڑھتی رہیں۔ اہل بابل نے سوجریوں کی دکھائی ہوئی راہ پر سفر کیا۔ ان کے پیچھے آشوری آئے، ادھر سے مصری قدیم ورثہ کے ساتھ چلے۔ دونوں شام و فلسطین کے علاقہ میں مل گئے اور ان کے پیچھے یہودی اور فینیشی آئے، ان کے نقش قدم پر اہل کریٹ ان کے پیچھے یونانی اور ان کے بعد رومی۔ زندگی کی طویل شاہراہ پر قافلے آگے پیچھے نظر آتے ہیں۔ ۱۵ ویں صدی کے بعد مغربی قافلہ جو روم کی رہنمائی میں قدیم شاہراہ پر گامزن تھا، منتشر ہو گیا لیکن پھر دوبارہ اسی راہ پر چل پڑا یعنی رومی شاہراہ پر اور اب اسی پر چل رہا ہے یا یوں کہیے کہ ہر قدم پیچھے کی طرف پڑ رہا ہے اور مغربی قافلہ کسی نئی راہ پر نہیں چل رہا ہے بلکہ قدیم راستہ پر ہی گامزن ہے۔[۲۴]

مثال کے طور پر نظریہ فرائڈ کو لے لیجیے۔ فرائڈ نے آزادانہ جنسی اختلاط کی حمایت کی اور اس

کے لیے پورا فلسفہ اسے وضع کرنا پڑا لیکن اس پر آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اس سے پہلے بھی لوگ آزادانہ جنسی اختلاط کی حمایت کر چکے ہیں اور انہوں نے معاشرے کی پابندیوں اور بندشوں کو توڑ دینے کی دعوت دی ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ بالکل ابتدا میں آزادانہ جنسی تعلقات تھے یعنی بالکل جانوروں کی طرح۔ شادی بیاہ کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ مارگن (Margan) جس نے غیر مہذب قبائل کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے، کہتا ہے کہ پہلے قبیلہ کے اندر بلا امتیاز جنسی تعلقات تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ قبیلہ کی تمام عورتیں تمام مردوں کی مشترکہ بیویاں ہوتی تھیں اور دوسری طرف سے دیکھیے تو عورتوں کے شوہر بھی مشترک ہوتے تھے، ان سے جو بچے ہوتے تھے وہ بھی مشترک سمجھے جاتے تھے۔

عورت کی بدچلنی کوئی گناہ کی بات نہ تھی بلکہ ایک جرم تھی اس صورت میں جبکہ شوہر کی مرضی کے خلاف ہو ورنہ وہ خود اس سلسلہ میں کافی فیاض واقع ہوا تھا۔ اپنے دوست یا مہمان کی دلجوئی کی خاطر بلا تکلف اپنی بیوی کو پیش کر دیتا تھا کیوں کہ وہ جائداد کے مثل تھی۔

تقریباً ۱۷۰۰ تا ۱۲۰۰ کا زمانہ جزیرہ کریٹ کی تاریخ کا سنہرہ دور سمجھا جاتا ہے۔ اتنے قدیم دور میں بھی عورت کو مکمل آزادی حاصل تھی۔ وہ ہر جگہ مردوں کے دوش بدوش کام کرتی تھی، پبلک اجتماع میں نہایت آزادی کے ساتھ شریک ہوتی۔ کھیل کے میدان میں آگے کی نشستوں پر بیٹھتی نہ صرف دیکھتی بلکہ بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتی تھی، رنگین، بھڑکیلے، چست، جاذب نظر کپڑوں میں ملبوس، سینہ کو بالکل عریاں کیے ہوئے، لبوں پر سرخی لگائے ہوئے اور ہیٹ اوڑھے محفلوں اور معاشرہ کے دوسرے شعبوں میں ''رنگ پاشی'' کرتی نظر آتی تھی۔

یونان کے مشہور اسٹیٹ اسپارٹا میں شادی سے پہلے کافی جنسی آزادی تھی اس لیے طوائفوں یا ''سوشل گرلز'' کے یہاں زیادہ چرچے نہ تھے۔ انہیں سن بلوغ تک بالکل برہنہ رکھا جاتا تھا تاکہ انہیں اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رہے۔ لڑکوں کی طرح یہ بھی ورزشیں کرتی تھیں، کھیلوں میں حصہ لیتی تھیں، پبلک رقص اور جلوسوں میں بالکل عریاں رہتی تھیں، عورتیں ڈھیلا لباس پہنتی تھیں

جو کندھوں پر ڈھلکا رہتا تھا اور بازو کھلے رہتے تھے، ٹانگیں بھی کھلی رہتی تھیں تا کہ نقل و حرکت میں دشواری نہ ہو۔

اسپارٹا کے مشہور مقنن لائکرگس کے بارے میں اس کے سوانح نگار پلوٹارک (Plutarck) نے لکھا ہے کہ وہ جنسی اجارہ داری کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ لوگ کتوں اور گھوڑوں کی عمدہ نسل چلانے کی خاطر تو کوشش کرتے ہیں، دولت خرچ کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں کو قید میں رکھتے ہیں تا کہ صرف انہیں سے اولاد ہو، چاہے بیوقوف، کمزور اور بیمار ہی کیوں نہ ہو۔

پھر ایک وقت آیا جب رومیوں نے ایران کو فتح کیا لیکن وہ ان کی تہذیب و ثقافت کے آگے گھٹنا ٹیکنے پر مجبور ہو گئے۔ یونانیوں نے اپنی مغلوبیت کے دور میں بھی رومیوں، مذہب، ڈرامہ، اپنا اخلاقی نظام، اپنا فلسفہ و آرٹ اور اپنی ثقافت دے دی، یہ ایک ایسا سیلاب تھا جسے رومی نہ روک سکے اور پورا روم اسی تہذیب کے دھارے میں بہہ گیا۔

رومی عورتیں پردہ کو بالائے طاق رکھ کر میدان میں نکل آئیں اور کلچرل مشاغل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگیں۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد نے یونانی زبان سیکھی، یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا، نظمیں لکھیں، لکچر دیے، رقص و موسیقی کے کلب قائم کیے، ملازمتوں پر قبضے کیے، تجارت پر چھانے لگیں، زنا کاری عام سی ہو گئی اور یہاں بھی وہی کچھ ہونے لگا جو یونان میں ہو رہا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب صنعتی و سائنسی انقلاب یوروپ میں آیا تو مروجہ عقائد و نظریات سب باطل ہو گئے۔ کلیسا کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اب دنیوی زندگی کو اہمیت دی گئی اور اس کی اچھی چیزوں سے جی بھر کر لطف اٹھانے کو زندگی کا مقصد قرار دیا گیا۔ اس نظریہ کے علمبرداروں نے یونان و روم کی تہذیب اور اس کے ادب پر جب نظر ڈالی تو اپنے نظریہ کی تائید میں پایا۔ پھر کیا تھا، اسی تہذیب کو بنیاد بنا کر ایک پورا فلسفہ تراشا گیا۔ زندگی کے تمام گوشوں کی اسی قدیم تہذیب کی روشنی میں رہنمائی کی گئی۔ اور اس طرح انسان ترقی کرتے کرتے پھر وہیں پہنچ گیا جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا ؏

پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

فرائڈ کے نظریے کو دیکھیے اور مندرجہ بالا افکار اور قدیم ماحول کو دیکھیے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قدیم دنیا میں جنس کے متعلق جو نظریہ چلا آ رہا ہے فرائڈ نے اس کی تکمیل کر دی۔ اور اپنے افکار و نظریاتی دلائل کے ذریعہ اسے تقویت پہنچائی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج "جدید معاشرہ" اسی پگڈنڈی پر آگے بڑھتا جا رہا ہے جس پر قدیم قومیں چل چکی ہیں۔

تہذیب اسلامی کے نقوش

سگمنڈ فرائڈ کے افکار و نظریات کا تجزیہ کیجیے اور بتایئے کہ اسلامی تاریخ کی مندرجہ ذیل درخشاں مثالیں کیا سماجی دباؤ کی وجہ سے یا اخلاق و روایات کے استحصال کے نتیجہ میں رونما ہوئیں؟

محمد بن جہم کو بعض ضروریات کے پیش نظر اپنا مکان فروخت کرنے کی ضرورت پیش آئی، وہ سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے پڑوس میں رہتے تھے، انہوں نے اعلان کیا کہ وہ مکان کے لیے پچاس ہزار درہم لیں گے، کچھ لوگ مکان خریدنے کے لیے ان کے پاس آئے، تو انہوں نے کہا "مکان کی قیمت تو پچاس ہزار درہم ہوگی، مگر یہ بتاؤ کہ سعید بن العاص کا پڑوس کتنے میں خریدو گے؟" خریداروں نے کہا "بھائی کہیں پڑوسی بھی بیچا جاتا ہے؟" ابن جہم نے کہا "جی ہاں، پڑوس کیسے نہیں بیچا جائے گا، میں اس کی قیمت الگ سے وصول کروں گا۔ جانتے ہو یہ کس کا پڑوس ہے، یہ ان کا پڑوس ہے کہ اگر تم ان سے کچھ مانگو گے تو تمہاری توقع سے بہت زیادہ ملے گا، اور اگر چپ رہو گے تو خود ابتدا کر دیں گے، اور اگر ان کے ساتھ برائی سے پیش آؤ گے تو ان کا شیوہ حسن سلوک ہوگا۔"

کسی نے اس بات کا تذکرہ سعید بن العاصؓ سے کیا انہوں نے ایک لاکھ درہم ابن جہم کو روانہ کیے اور کہلا بھیجا کہ "بھائی! مکان بیچنے کی کوشش نہ کرو اور مجھے اس غفلت کے لیے معاف کر

دو کہ میں اپنے ہمسایہ کی ضرورت سے بروقت واقف نہ ہو سکا۔"

ایک دفعہ محمد ﷺ کے پاس کچھ مہمان آئے، آپ ﷺ کے یہاں کچھ کھانے کو نہیں تھا، آپ نے فرمایا ان کو کون لے جائے گا؟ ایک صحابہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے اپنے کو پیش کیا اور مہمانوں کو لے گئے، گھر میں کھانا کم تھا، گھر میں یہ مشورہ ہوا کہ بچوں کو سلا دیا جائے گا، اور کھانا مہمانوں کے سامنے رکھ کر چراغ بجھا دیا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، مہمانوں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بھوکے اٹھ گئے مہمانوں کو اندھیرے میں پتہ نہیں چلنے پایا کہ ان کا میزبان کھانے میں شریک نہیں ہے، اور وہ خالی ہاتھ منہ تک لے جاتے رہے ہیں۔

سلطان ناصر الدین غلام خاندان کا درویش بادشاہ تھا، وہ اپنے مصرف کے لیے شاہی خزانے سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا تھا، ٹوپیاں سی کر اور قرآن شریف کی کتابت کر کے وہ گزارا کرتا تھا، ایک دن روٹیاں پکاتے ہوئے اس کی بیوی کے ہاتھ جھلس گئے، تو اس نے بادشاہ سے ایک خادمہ رکھنے کی درخواست کی، بادشاہ نے جواب دیا کہ "سرکاری خزانہ رعایا کی امانت ہے، ان پیسوں سے ہمیں خادمہ رکھنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ تم صبر کرو، اللہ ہمیں اس کا صلہ ضرور دے گا۔"

ابراہیم خواص نامی بزرگ ایک مرتبہ دریا کی سیر کرنے گئے، دریا کے کنارے کھجور کے پتے توڑ کر تفریحاً ٹوکرے بنانے لگے، یہ روز کا معمول بن گیا، روزانہ اسی طرح ایک ٹوکری بنا کر دریا میں ڈال دیتے، ایک دن سوچا کہ چل کر کیوں نہ دیکھیں کہ یہ ٹوکریاں کہاں جاتی ہیں، دریا کے کنارے چلنے لگے، کافی دور جانے کے بعد دیکھا ایک بڑھیا ندی کے کنارے بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے، بڑھیا سے رونے کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ "میرا خاوند مر گیا ہے، اور اس کے پانچ بچے یتیم ہیں، اب تک تو ٹوکریاں نکال کر روزانہ گزر کرتی رہی، اب تو ٹوکریاں بھی آنی بند ہو گئیں، اب میں کیوں کر زندہ رہوں گی۔" اتنا سن کر ابراہیم خواصؒ نے بچوں کی تربیت و نگرانی کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور بچوں کی تربیت کو ہی اپنی زندگی کا حاصل بنا لیا۔

مشہور سلجوقی بادشاہ سلطان الپ ارسلان کی شاہ قسطنطنیہ سے جنگ ہوئی، سلطان نے بقول

مشہور مورخ گبن شہنشاہ کو صلح کا پیغام بھیجا، لیکن اسے صلح میں کامیابی نہ ہوئی، بلکہ اسے سختی اور تشدد کا جواب ملا۔ الپ کو جب یقین ہو گیا کہ رومی شہنشاہ کی نخوت اور بیہودہ گوئی خدا جانے کس قدر بندگانِ خدا کا خون ناحق بہائے گی، تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ تخت سے نیچے اتر آیا۔ فرشِ خاک پر سر رکھ کر اللہ عزوجل کے حضور خشوع و خضوع کے ساتھ اپنی فروتنی و عاجزی کا اظہار کیا اور راہِ خدا میں استقامت کی دعا کی۔

چنانچہ فتح کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھا، شہنشاہِ روم بھی دیگر اسیرانِ جنگ کے ساتھ دربار سلطانی میں پیش ہوا۔

مورخ گبن لکھتا ہے:

''جب شہنشاہ روم الپ ارسلان کے سامنے آیا، تو سلطان تخت سے اٹھا، چند قدم آگے بڑھا، نہایت تپاک کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا اور عزت واحترام کے ساتھ اپنے برابر اسے جگہ دی ہفت روزہ جشن شاہانہ کے بعد سلطان نے اس سے کہا:

''شکست کے بعد تمہیں کس سلوک کی امید ہو سکتی ہے۔''

شہنشاہ نے بے ساختہ کہا: ''اگر ظالم ہو تو قتل کر دو، متکبر ہو تو مجھے قید میں ڈال دو، اور اگر دور اندیش اور فیاض ہو تو فدیہ لے کر آزاد کر دو۔''

سلطان نے کہا: ''اگر مجھے شکست ہو جاتی اور میں قید ہو جاتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔''

شہنشاہ نے کہا: ''اگر تم قید ہوتے تو میں تمہارے لیے سزائے تازیانہ تجویز کرتا۔''

انگریز مورخ گبن اس جواب کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''اگر یہ جواب دور اندیشی کا مقتضی نہ تھا تو احسان فراموشی میں ضرور شامل تھا۔''

سلطان یہ گستاخانہ جواب سن کر ہنس پڑا، اور کہا:

''عیسائیوں میں یہ دستور ہو تو ہو لیکن اسلام ہمیں ایسی تعلیم کی اجازت نہیں دیتا،

الحمدللہ! کہ میں تمہارے قید میں نہیں ہوں، میں آپ کے ساتھ وہی سلوک کروں گا، جس کی اسلام نے مجھے اجازت دی ہے۔"

چنانچہ سلطان نے دس لاکھ دینار بطور فدیہ، ساٹھ ہزار دینار سالانہ خراج اور مسلمان اسیران جنگ کی رہائی پر شہنشاہ سے صلح کر لی۔

سلطان محمود غزنوی نے ایک بار حضرت ابوالحسن خرقانیؒ سے ملاقات کرنے کے لیے ان کی کٹیا پر حاضری دی۔ شاہانہ لباس ایاز کو پہنایا اور خود ایاز کا لباس زیب تن کیا اور دس نوجوان لونڈیوں کو بھی مردانہ لباس پہنا کر اپنے ساتھ لیا، حضرت کی کٹیا پر پہنچا اور "السلام علیکم" کہا۔ حضرت نے بیٹھے ہی بیٹھے بغیر کسی تعظیم کے "وعلیکم السلام" کہا۔ آپ نے فرمایا "یہ تو ایک جال ہے۔" محمود نے متبسم ہو کر کہا "کاش آپ جیسے پرند اس جال میں پھنس سکتے۔" حضرتؒ نے محمود کا ہاتھ کر پکڑ کر مسند کے برابر بٹھایا، اور باقی ہمراہیوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

محمود: حضرت! کچھ فرمایئے۔"

درویش: "پہلے نامحرموں کو باہر نکال دو۔"

چنانچہ بادشاہ کے حکم سے تمام لونڈیاں جو مردانہ لباس پہنے ہوئے تھیں، باہر ہو گئیں۔

محمود: حضرت بایزید بسطامیؒ کے حالات واقوال سے کچھ بیان فرمایئے۔

درویش: حضرت بایزید بسطامی کے اقوال سننے کی تاب ہے تو سنو، وہ فرماتے ہیں: "جس نے مجھے دیکھا وہ اپنی بدبختی سے بے خطر ہو گیا۔"

محمود: آنحضرت ﷺ کو ابوجہل، ابولہب اور کتنے منکروں نے دیکھا، اور وہ بدبخت ہی رہے، کیا حضرت بایزید بسطامی کا درجہ آنحضرت ﷺ سے بلند ہے کہ ان کو دیکھتے ہی بدبختی کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

درویش: بس اسی لیے کہتے تھے کہ حضرت بایزیدؒ کا کوئی قول سناؤ، ان کے اور دیگر صوفیائے کرامؒ کے اقوال سننے کی تاب وہی لوگ لا سکتے ہیں، جو اس رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ محمود! یاد

رکھو کہ آنحضرت ﷺ کو سوائے ان کے چار یار اور کبار صحابہؓ کے کسی نے حقیقت میں نہیں دیکھا، اگر ابولہب، ابوجہل اور دیگر منکرین اس نظر سے دیکھتے، جس نظر سے خلفائے راشدین نے دیکھا تھا تو وہ فی الواقع اپنی بدبختی سے دور رہتے، لیکن ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۔ (اعراف:۱۹۸)

محمود: یا حضرت! اب مجھے نصیحت فرمائیے۔

درویش: چار باتوں کا خیال رکھو، (۱) ممنوعات سے پرہیز (۲) نماز با جماعت (۳) سخاوت (۴) حق تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت و مہربانی۔

آخر میں محمود نے حضرت کو اشرفیاں دینی چاہیں، لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔

سلاطین گجرات میں ایک نامی بادشاہ گذرا ہے۔ ایک مرتبہ اس کے داماد نے جوانی و حکومت کی سرمستی و غرور میں ایک آدمی کا ناحق خون کر دیا، سلطان کو خبر ہوئی، اس نے گرفتار کر کے مقدمہ قاضی کے پاس بھیجا، قاضی نے مقتول کے وارث کو راضی کر کے ۲۲ اشرفیاں خون بہا میں تجویز کیں، بادشاہ نے کہا: بیشک مقتول کا وارث راضی ہو گیا ہے، لیکن اس قسم کے کمزور فیصلوں سے بدشعار اور بدمست دولت مندوں کو حوصلہ ہو جائے گا، جس کو چاہیں گے جان سے مار کر چند اشرفیاں خون بہا میں دے دیں گے، اس لیے اس مقدمہ میں خون بہا کے بدلے قصاص لینا چاہیے۔ چنانچہ اپنے داماد کو پھانسی کی سزا دی اور حکم دیا کہ لوگوں کو خصوصاً دولت مند قرابت داروں کی عبرت کے لیے ایک دن رات تک لاش لٹکتی رہے۔

تاریخ اسلام کے یہ واقعات کیا دباؤ اور جنسی عوامل کے تحت تھے؟ یہ سارے زریں کارنامے نظریۂ فرائڈ کا منہ چڑھا رہے ہیں۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ وحیدالدین خاں، علم جدید کا چیلنج، لکھنؤ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء، ۱۹۶۵ء، ص ۱۹ بحوالہ، Religion without Revelation, New York, 1958, p. 58.

۲۔ نفس مصدر، ص ۲۴-۲۵ بحوالہ، Encyclopaedia of Social Sciences, Vol. 13, p. 233.

۳۔ سہ روزہ دعوت نئی دہلی، ۲۰ر جنوری ۱۹۷۸ء

۴۔ سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، ۱۱ر جون ۱۹۷۷ء

۵۔ اردو ٹائمز، بمبئی، ۱۶ر جولائی ۱۹۷۸ء

۶۔ الیکس کیریل، انسان نامعلوم، بحوالہ محمد قطب، التطور والثبات فی حیاۃ البشریۃ، اردو ترجمہ انسانی زندگی میں جمود وارتقاء، ساجد الرحمٰن صدیقی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۱

۷۔ ول ڈیورانٹ، نیرنگئ فلسفہ، ج ۱، ص ۶، بحوالہ انسانی زندگی میں جمود وارتقا، ص ۱۸۱-۱۸۲

۸۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، یہودیت ونصرانیت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۳۱۰

۹۔ محمد قطب، اسلام اور جدید مادی افکار، ترجمہ: سجاد احمد کاندھلوی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۷ کا حاشیہ نمبر ۱

۱۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد اسد، اسلام دوراہے پر، اردو ترجمہ رحم علی الہاشمی، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۸ء

۱۱۔ یہودیت ونصرانیت، نفس مصدر، ص ۳۰۴-۳۰۵

۱۲۔ الرسالہ دہلی، فروری ۱۹۷۷ء

۱۳۔ انسانی زندگی میں جمود وارتقا، حوالہ بالا، ص ۳۷-۳۹

۱۴۔ اسلام اور جدید مادی افکار، حوالہ بالا، ص ۵۵-۵۶

۱۵۔ نفس مصدر، ص ۵۹-۶۱

۱۶۔ رفیع الدین، قرآن اور علم جدید، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۱۹

۱۷۔ طوطمیت (Totemism)، ٹوٹم رکھنے کی رسم اور اُن رسوم و روایات کی ادائیگی جو اس سے متعلق ہیں۔ قدیم تہذیبوں کی رو سے مظاہر فطرت میں سے کوئی چیز، عموماً کوئی جانور جس کو کسی قبیلے، خاندان یا ہم رشتہ جماعت نے اپنی علامت یا اپنے تشخص کا نشان قرار دیا ہو، اُسے طوطم یا ٹوٹم کہتے ہیں۔ دیکھیے: قومی انگریزی اردو لغت، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، جلد دوم، ص ۲۱۱۲

۱۸۔ اسلام اور جدید مادی افکار، حوالہ بالا، ص ۴۷

۱۹۔ محمد تقی امینی، لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۵۶،

۲۰۔ قرآن اور علم جدید، حوالہ بالا، ص ۱۹

۲۱۔ دیکھیے الطنطاوی، علی، ابو بکر الصدیق، المطبعۃ السلفیۃ، قاہرہ ۱۳۷۲ھ، ص ۱۴۷

۲۲۔ ہیکل، محمد حسین، الفاروق عمر، مطبعۃ مصر شرکۃ مساھمۃ مصریۃ، قاھرہ، ۱۳۶۴ھ، ص ۱۰۶

۲۳۔ ڈاکٹر محمد ذکی، مغربی تہذیب۔ آغاز و انجام، علی گڑھ ۱۹۷۱ء، ص ۵۹-۶۰

☆☆☆

استشراق یا استعمار

پروفیسر آرنلڈ کے نظریاتِ خلافت کا مطالعہ

منہج بحث اور منصوبہ

زیرِ نظر مقالہ میں گفتگو مرکوز ہے سیاسی فکر اور سیاسی اقدار و معیارات پر جو یونان کی سرزمین سے ابھرے اور مغرب جدید کے سیاسی نظریات کے لیے منبع اور مصدر قرار پائے جن پر مغرب اتنا نازاں ہوا کہ اس نے دوسری تہذیبوں، ثقافتوں اور فلسفوں کے عطیات اور افکار سے آنکھیں موند لیں اور عالمی انسانی یوگ دان کا انکار کر دیا۔ ان معیارات و افکار کا تقابل اسلام کے عقائد و نظریات اور سیاسی فکر سے کیا گیا ہے اور دونوں کے تہذیبی و سماجی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کیوں کہ تہذیب پرورش پاتی ہے ایک مخصوص جہانی نظریہ کی گود میں۔ جب تک اُس جہانی نظریہ کی تفہیم نہ ہو اس کے بطن سے جنم لینے والی تہذیب بھی فہم کی گرفت سے باہر رہے گی۔ اس پس منظر میں معروف زمانہ مستشرق سر تھامس آرنلڈ کے افکار و نظریات- جو اسلام کے ادارۂ خلافت کی نظریہ کاری کرتے ہوئے انہوں نے رقم کیے ہیں- کا ناقدانہ مطالعہ پیش نظر ہے تا کہ اسلام کے مخصوص جہانی نظریہ کے تناظر میں اس کے سیاسی افکار اور اداروں کی تفسیر کی جائے اور علمائے مغرب کی فکری و علمی جارحیت کو بے نقاب کیا جائے۔

اس مطالعہ میں اسلامی سیاسی فکر کا حوالہ اس کے دو بنیادی مصادر قرآن اور حدیث سے دیا گیا ہے کہ اسلام کے مثالی نظریہ اور اس کی عینی قدروں کو ان ہی مآخذ کی روشنی میں تلاش کرنا درست ہے۔ مسلم سیاسی تاریخ اور خلفائے اسلام کے تابناک اور عظیم الشان ادوار کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے معیار بھی ان مآخذ سے ملتا ہے اس معاملہ میں علمائے مغرب نے بالعموم جراحت آمیز غلطیاں کی ہیں۔ انہوں نے اسلام کے مصادر و مآخذ کی روشنی میں سیاسی ظواہر کا مطالعہ کرنے کی بجائے سیاسی ظواہر، تنظیمات اور اداروں کے طریقہ کار، نظام عمل اور ثمرات و نتائج کی روشنی

میں اسلام کے بنیادی مآخذ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس غیر منطقی اور معکوس ترتیب اور منہج کو واقعیت پسندی (Pragmatism) اور ادراک (Realism) کا نام دیا ہے۔

مغربی فکر کا یونان میں سراغ

فکر سیاسی کا نقطۂ آغاز یونانی مفکرین کے اس تصور سے کیا جاتا ہے کہ انسان اپنی تخلیق اور فطرت کے اعتبار سے تغلّب پسند واقع ہوا ہے۔ دوسروں پر اختیار و اقتدار پانا اس کی فطری چاہت ہے۔ اس چاہت کی تکمیل میں بسا اوقات وہ جبر اور تشدد سے بھی کام لیتا ہے اور اقتدار کے غلط استعمال سے انحراف کی راہ کھولتا ہے۔ یہیں سے یہ سوال ابھرا کہ وہ کون سے ایسے وسائل ہیں جنہیں استعمال کیا جائے تو اقتدار کے غلط اور بے جا استعمال پر بندش لگ جائے۔

دوسرے لفظوں میں سیاسی اختیار و اقتدار ایک اجتماعی و معاشرتی ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جو انسانی معاشروں کے قیام و استمرار کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ضرورت کبھی اپنے خیر سے متجاوز ہو کر شر میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جبر و جور کے وسائل کو استعمال کر کے استبداد میں ڈھل جاتی ہے چنانچہ اس ناگزیر سیاسی اقتدار کو شر میں تبدیل ہونے سے روکنے کے لیے ضروری وسائل و تدابیر کی تلاش شروع ہوئی اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مفکرین سیاست نے مختلف معیارات اور اقدار تجویز کیں اور خود اسلام نے بھی اپنے عقائد و نظریات کے جلو میں اس کو حل کیا اور سب سے بہتر اور پائدار حل پیش کیا۔

مغرب جدید کی سیاسی فکر اپنے تمام افکار اور اداروں کے لیے قدیم یونانی تہذیب کا مرہون ہے یہاں تک کہ اس کی بیشتر اصطلاحات بھی فکر یونان سے مستعار ہیں۔ مختلف نظامہائے حکومت، جو مغرب نے متعارف کرائے ہیں، ان کی تقسیم و تعیین بھی یونان کی عددی تقسیم سے ماخوذ ہے۔ یونانی مفکرین نے اقتدار پر قابض افراد کے عددی تناسب کی رعایت میں حکومتوں کی تقسیم فرد واحد کی حکومت، اقلیت کی حکومت اور اکثریت کی حکومت کی اصطلاحوں میں کی ہے۔ فرد واحد

کی حکومت کی مختلف صورتیں انہوں نے بیان کی ہیں: بادشاہت (Monarchy)، جس میں بادشاہ اختیارات کا سرچشمہ ہوتا ہے اور حکومت موروثی ہوتی ہے، استبدادی حکومت (Despotism) جس میں ایک مطلق العنان شخص قوت اور جبر سے مسلط رہتا ہے اور آمریت (Dictatorship) جس میں عبوری طور پر مخصوص حالات میں ایک جابر شخص حکومت پر قبضہ جما لیتا ہے۔ اقلیت کی حکومت کی بھی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں: اُشرافیہ (Aristocracy) جس میں اشراف شاہی، طبقۂ خواص، امراء، خاندان یا بلند منصب افراد کی حکومت ہوتی ہے اور وہی تمام اختیارات کا مرکز ہوتے ہیں، امراء شاہی یا چند سری حکومت (Oligarchy) جس میں طاقت چند لوگوں میں مرتکز ہوتی ہے اور وہ موروثی طور پر حکومت پر قابض رہتے ہیں۔ اکثریت کی حکومت کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں: جمہوریت (Democracy) یعنی سواد اعظم کی حکومت اور انارکی حکومت (Anarchism) جس میں عوام لاقانونیت کا مظاہرہ کرتی اور کسی قانون اور انتظامیہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

حکومت کی یہ عددی تقسیم یونان کے تصور ''شہری ریاست'' (City State) کے سیاق میں تھی۔ یونانی مفکرین کے نزدیک شہری ریاست کا مطلب شہریوں کے ایسے مجموعہ سے تھا جو مختلف معاشی اور معاشرتی مفادات اور اداروں سے وابستہ تھے مگر عوامی مشترک امور میں ان کے درمیان رابطہ اور تعامل تھا اور وہ ریاست میں اپنے معاشی و معاشرتی مقام اور کردار کے تناسب سے اشتراک عمل کرتے تھے۔ اسی لیے یہ تبصرہ علمائے سیاست نے کیا ہے کہ یونان کی سیاسی فکر میں ''دستور'' اور ''معاشرہ کے سیاسی تشخص'' کے مفاہیم میں التباس پایا جاتا ہے۔ یونانی مفکرین دستور، اس کے احترام، اس کے ہیکل پر گفتگو کرتے ہیں مگر اس سے ان کا مطلب پہلے سے طے کردہ کوئی ایسا مجموعۂ قوانین وضوابط نہیں ہوتا جو حکومت کے حقوق وفرائض کی باقاعدہ تعیین کرتا ہو اور رعایا سے اس کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہو، جیسا کہ دورِ جدید میں دستور کی اصطلاح کا مفہوم متعین ہے۔ دستور سے ان کی مراد یہ تھی باشندگانِ ریاست کے عوامی معاملات میں

اشتراک وتعاون اور اُن کے معاشی ومعاشرتی حالات ووقائع کے درمیان ایک تناسب قائم رہے یعنی ریاست کا سیاسی وجود اور تشخص اس کے معاشرتی ومعاشی حقائق وحالات کی تفصیل کو انگیز کرتا رہے۔اس سے یہ مطلب نکالنا غلط نہ ہوگا کہ تقسیم حکومت کے متعلق یونانی فکر پوری طرح عددی معیار سے مربوط اور معاشرہ کے حقائق ووقائع سے ہم آہنگ ہے یعنی حکام کی تعداد دیکھ کر مفکرین اسے قلت وکثرت یا اشرافیہ وجمہوریت کے خانوں میں تقسیم کرتے رہے۔اسی لیے افلاطون اور ارسطو کی تحریروں میں بڑا خلط مبحث ہے کہ دستوری حکومت کی تعریف کیا ہے اور عوام کے مفادات کی نگہبانی کرنے والی حکومت کسے کہتے ہیں۔دستوری اور آمرانہ حکومتوں میں فرق وتمیز کی بنیاد اُن کے ہاں سابق قانون کے سامنے سرتسلیم خم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی اساس ایک گروہ کے مفادات کا تحفظ اور ایک متعین معاشی ومعاشرتی طبقہ کے مصالح کی نگہبانی ہے۔افلاطون جیسا مفکر اپنی مثالی ریاست (Ideal State) میں سیاسی مسئلہ کا حل بس یہ پیش کر کے رہ جاتا ہے کہ حکومت فلاسفہ کے سپرد کر دی جائے کیوں کہ اس کے نزدیک برتری اور فضیلت کا معیار تنہا علم ہے۔یہ حکومت ایک روشن خیال فلسفی کی حکومت ہے جسے رہنمائی کے لیے کسی قانون کی، کسی روایت اور عُرف کی قطعاً حاجت نہیں ہے۔

ریاست کا مغربی تصور

مفکرین سیاست کا ایقان واعلان ہے کہ دور جدید میں ریاست کا تصور۔یعنی سیاسی اختیارات کی تنظیم جن کی پشت پر ایک مستحکم اور منصوبہ بند قانون کی کارفرمائی ہو۔یونانی افکار و نظریات ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔پہلے فرد واحد مطلق اور مستبد ہوتا تھا اور کسی قانون کی پابندی اس پر لازم نہ تھی مگر آج ریاستی تنظیم قانون سازیہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے تمام اعضائے حکومت میں ایک قانونی نظام کی پابند ہے اور اب افراد کی حکومت کی جگہ قانون کی حکومت ہے۔اس جدید تصور ریاست میں مفکرین مغرب نے دو ستونوں پر انحصار کیا ہے:

۱۔ قانون کا وجوب ولزوم

۲۔ قوم کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا اصول

یہ مفکرین سمجھتے ہیں کہ ان دو اصولوں کی پاسداری سے سیاسی مطلق العنانی پر قابو پایا جا سکتا ہے اور اسی لیے انسانی تاریخ کی تمام سیاسی جدوجہد اور ماہرین عمرانیات وسیاسیات کے افکار و نظریات کا اسے خلاصہ اور عطر تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ دور جدید کی تمام سیاسی بحثوں اور تحقیقات کا محور یہی دو نکات ہیں۔ انہی کے اردگرد علوم سیاسی گردش کرتے نظر آتے ہیں۔

مانٹیسکو کی روح قوانین

مغربی علمائے سیاست نے وجوبِ قانون کے دور جدید کی ریاست کے لیے اساسی اصول تسلیم کیا ہے اور اس نظریہ کا موجد و بانی ان کی نظر میں بیرن ڈی مانٹیسکو (Baron de La Brede et de Montesquieu) ہے۔ جس نے اپنی معروف زمانہ تصنیف La Spirit de Lois ۱۷۴۸ء میں شائع کی۔ گرچہ اس کتاب میں اس مفکر نے یونانی عددی معیار پر انحصار کرتے ہوئے حکومتوں کی تقسیم کی ہے مگر اپنے نظریۂ قانون سے اس نے استبداد اور مطلق العنانی کو روکنے کی کامیاب نظریہ کاری کی ہے۔

مانٹیسکو کے مطابق جو چیز اپنا وجود رکھتی ہے وہ لازمی طور پر اپنے قوانین بھی رکھتی ہے۔ دیوتاؤں کے اپنے قوانین ہیں۔ جانوروں کا قانون الگ ہے۔ انسانوں کے اپنے قوانین ہیں مگر قدرتی قوانین سب سے بہتر ہوتے ہیں اس لیے انسانوں کو چاہیے کہ وہ قدرتی قوانین کو ترجیح دیں اس لیے کہ ان سے انصاف کی ضمانت فراہم ہوتی ہے۔ فاضل مفکر نے حکومت کی تین اقسام بیان کی ہیں اور ہر طرز حکومت کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اس کے مطابق وہ تین قسمیں درج ذیل ہیں:

۱۔ بادشاہت (Monarchy)، جس میں فرد واحد قانون کے مطابق حکومت کرتا ہے۔

۲۔ جابرانہ (Despotism)، جس میں غیر قانونی طور سے ایک شخص مطلق العنان حکومت

چلاتا ہے۔

۳۔ جمہوریہ (Republic) جس میں سیاسی اقتدار عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جمہوریہ مانٹیسکو کے مطابق مزید دو قسموں میں بٹ جاتی ہے: ایک ڈیما کریسی، جس میں اقتدار کی کنجی عوام کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، دوسری اشرافیہ جس میں چند افراد ہی اقتدار کے مالک ہوتے ہیں۔ ان تینوں اقسام حکومت کی اساس مانٹیسکو کے پیش رو مفکرین کی تحریروں سے مختلف ہے۔ جمہوریہ کی بنیاد خیر پر ہے، بادشاہت کی اساس عزت اور شرف پر ہے اور جابرانہ حکومت خوف پر قائم ہوتی ہے۔

مانٹیسکو کا ایک اہم نظریہ تفریق و تقسیم اختیارات (Theory of Separation of Powers) ہے۔ اس نے انگلستان کے دورے میں وہاں کے سیاسی افکار اور اداروں کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور فرانس میں سیاسی اصلاحات کے لیے اس نظریہ کو پیش کیا۔ اس نظریہ کے مطابق ''اگر مقنّنہ اور انتظامیہ کے اختیارات ایک ہی فرد یا جماعت کے سپرد کر دیے جائیں تو وہ فرد یا جماعت ہر دباؤ سے بے خوف ہو کر ظالمانہ قوانین بنائے گی اور ان کو ظالمانہ طریقے سے نافذ کرے گی۔ اگر انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات ایک فرد یا افراد کی ایک جماعت کو دے دیے جائیں تو بھی افراد کی آزادی پامال ہوگی۔'' اس لیے حکومت کے تینوں شعبے۔ مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ۔ ایک دوسرے سے الگ رہیں تا کہ وہ ایک دوسرے پر اثر انداز نہ ہوں۔ اس سے افراد کی آزادی اور ان کی سیاسی و سماجی حریت محفوظ رہ سکتی ہے۔ تقسیم اختیارات کا یہ نظر اس کی ''روح قوانین'' کی گیارھویں کتاب کے چھٹے باب میں بطور خاص زیر بحث آیا ہے۔ یہ کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے جو ۱۷۳۴ء میں اس نے تحریر کیا تھا اور میز کی دراز میں نظر ثانی اور تصحیح و تہذیب کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ اٹھارھویں صدی کی سیاسی تحریروں میں اس حصہ کتاب کو رجحان ساز قرار دیا گیا کیوں کہ مغرب کی جدید سیاسی تاریخ میں ریاست ہائے متحدہ کے دستور کی تشکیل میں اس نے موثر کردار ادا کیا۔ اور آنے والے ادوار میں تمام ملکوں کے دساتیر اسی نظریہ کی بنیاد پر تشکیل دیے گئے۔

مانٹیسکو کا نظریۂ قانون مغرب کی تاریخ میں بڑا انقلاب آفریں اور دور رس اثرات کا حامل ثابت ہوا۔ کسی مرتب اور منظّم مجموعۂ قانون کی بالا دستی اب مطلق العنانی، استبداد اور آمریت کی جگہ معیار قرار پائی مگر مفکرین سیاست نے ایک نہایت اہم اشکال یہاں قائم کیا اور وہ اس نظریہ کی تاثیر اور موثر قوت نافذہ کے متعلق تھا۔ انہوں نے مانٹیسکو کی تحریروں میں تلاش کرنے کی کوشش کی کہ اس نے قانونی (Legal) اور سیاسی طور پر جائز ومشروع (Legitimate) کے درمیان فرق کیوں نہیں کیا۔ لفظ سیاسی طور سے جائز اور مشروع اقدام اپنے مخصوص اور متخصصانہ تصور کے اعتبار سے اُس اقتدار او اختیار کے وجود اور اس کی ماہیت کو استناد و اعتبار عطا کرتے ہیں جس کی ذات سے احکام صادر ہوتے اور عوام کے لیے واجب الاتباع ہوتے ہیں اور اسی لیے Legitimacy یعنی سند جواز و استحقاق اپنے ابعاد و اطراف کے اعتبار سے فلسفہ سیاسیات یعنی آئیڈیالوجی کا موضوع ہے جبکہ لفظ قانونی (Legal) کی اصطلاح ایک سلطنت کے قیام اور ایک قانونی نظام کی تشکیل سے عبارت ہے جس میں پہلا مرحلہ دوسرے مرحلے کی تابعداری کرتا نظر آتا ہے۔ یہ اصطلاح اپنے مفاہیم و تصورات کے ساتھ دراصل ریاست کے قانونی نظریہ کی ترجمانی کرتی ہے یعنی یہ ریاست کا تجزیہ و تحلیل ایک قانونی نظام کے طور پر کرتی ہے۔ اس کے برعکس اول الذکر اصطلاح اپنے تمام ابعاد و اطراف کے ساتھ ریاست کے قانونی نظام سے ماورا مسائل سے بحث کرتی ہے اور اس سے پہلے وجود میں آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے کہ ''سیاسی طور پر جائز ومشروع'' کی اصطلاح اس صلاحیت اور معتبریت کے موضوعات سے تعرض کرتی ہے جس پر ریاست کا قانونی نظام وجود میں آتا ہے۔ اس لیے ناگزیر طور پر دونوں کے موضوعات، مسائل اور احکام مختلف ہوں گے۔ اول الذکر کا محور فلسفہ اور نظریہ ہے جبکہ آخر الذکر کا مرکز قانون ہے فلسفہ نہیں۔

سیاسی طور پر جائز ومشروع (جسے استحقاق کی سند حاصل ہو) کی اصطلاح اور قانونی اقدام کی اصطلاح میں اوپر جو متخصصانہ اور لطیف فرق بیان ہوا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ لازم ٹھہرا کہ کسی

حکومت کے قانونی ہونے اور عوام پر اس کے واجب الاتباع ہونے کے لیے یہ بات کافی ہو کہ حکومت کی جانب سے صادر ہونے والے احکام وقواعد اس کے دستوری نظام کے اندر رہ کر تشکیل دی گئی کارروائیوں سے ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقتدار اور ریاست سے جاری ہونے والے فیصلے اور قانونی وانتظامی احکامات اگر اس کے قانونی نظام کے موافق ہیں تو اس سے حکومت کو سند جواز اور استحقاق حاصل ہو جاتا ہے اس طرح مغربی سیاسیات کی لغت میں ان دونوں اصطلاحوں میں خلطِ معنیٰ اور التباسِ فکر پیدا ہو گیا جس نے علم سیاسیات میں بڑی الجھنوں کو جنم دیا۔[۲]

قانونی ودستوری طریقہ کار کی ضمانت

جائز اور قانونی کی ہر دو اصطلاحوں میں خلطِ مفاہیم کا اثر مغرب کی اُن ضمانتوں کی تصویر کشی پر پڑا جو حکومت کو مطلق العنانی اور فکری وسیاسی استبداد سے محفوظ رکھنے کے لیے اور دستور کی بے قید وشرط وفاداری کی راہ پر گامزن رکھنے کے لیے مفکرین نے فراہم کیں۔ یہ ضمانتیں تمام تر نظریہ کاریوں کے باوصف قانون کے گرد طواف کرتی رہیں اور قانون بھی وہ جو حکومت کا تراشیدہ تھا اور جس کی تفصیلات حکومت کے کل پرزوں اور اداروں نے تیار کی تھیں۔ یہ ضمانت تھی حکومت کے فیصلوں اور قراردادوں کے دستور کے مطابق ہونے کی نگرانی اور احتساب کا عمل تا کہ کوئی حکومت دستوری قوانین سے کھلواڑ نہ کر سکے۔ احتساب کا یہ عمل یا تو پیش بندی کے طور پر کسی سیاسی کمیٹی یا ہیئت کے ذریعہ انجام دیا گیا جس کی تشکیل دستور سے پہلے کر دی گئی اور اس اندیشہ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا کہ اس کمیٹی یا ہیئت کے عمل میں کوئی انحراف اور بگاڑ آ سکتا ہے حالانکہ وہ سیاسی ہیئت تھی۔ دوسری صورت احتساب اور نگرانی کے لیے یہ اختیار کی گئی کہ ایک عدالتی ہیئت وجود میں آئی اور اس نے دستوری بنچ تشکیل دے کر حکومت کے قانون کو کالعدم کر دیا یا ملک کی اعلیٰ عدالتوں میں ایسے قوانین اور فیصلوں کو چیلنج کیا گیا اور ان کا خلاف دستور ہونا ثابت کیا گیا۔ مگر

یہاں یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ اس طرح کی عدالتی ہیئتیں حکومت کے نظام کار کا حصہ ہوتی ہیں اور شکل وصورت کے اعتبار سے انہیں خواہ مکمل آزادی وخود مختاری حاصل ہو، وہ برسر اقتدار طبقہ سے یا حکومت کے سیاسی اداروں کے مابین جاری کشمکش سے کسی نہ کسی شکل میں متاثر ضرور ہوتی ہے اور اگر ان عدالتی ہیئتوں یا سیاسی کمیٹیوں کے اراکین کی تقرری بصورت انتخاب ہوتی ہے تو مروجہ سیاسی حالات اور نظاموں سے ان کا متاثر ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس طرح نگرانی اور احتساب کی یہ ساری ضمانتیں حکومت کے چشم وابرو کی منتظر رہ جاتی ہیں۔ اور مغربی حکومتوں کے عوام اور باشندے اپنے ملک کے قانون اور فیصلوں کی پابندی پر مجبور ہوتے ہیں بشرطیکہ ان کی ظاہری شکل وصورت درست ہو یعنی دستور سے وہ ہم آہنگ ہوں خواہ حکومت کو سند جواز نہ ہو اور وہ اپنا استحقاق کھو چکی ہو۔

یہ صحیح ہے کہ اینگلو امریکی قانون نے حکومت کے استحقاق اور جواز (Legitimacy) کی ضمانت فراہم کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس نے قوانین اور دستور پر مستزاد معاشرہ کے اعلیٰ اہداف واقدار کی بھی نشاندہی کی جن کا تعلق نظام سیاسی کے فلسفہ اور روح سے ہے اور اس اعتبار سے قانونی ودستوری نظام سے بالا ہے مگر ان اعلیٰ اقدار واہداف کے خلاف خروج کو روکنے کے لیے جو ضمانتیں ہیں وہ اس اینگلو امریکی قانون کے فریم میں ہنوز مبہم اور مغلق ہیں۔

اینگلو امریکی قانون نے اس سیاق میں قانون کی حکمرانی (Rule of Law) کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا مطلب ملکی دستور کے احترام اور متعین کردہ قواعد وضوابط کی حکومت کے ذریعہ پابندی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے مضمرات بڑے دوررس اور ہمہ گیر ہیں اس اصطلاح میں دستور اور قانون سے ماورا معاشرہ کے اعلیٰ اہداف اور بلند اقدار اساسی بھی شامل ہیں جن کی رعایت حکومت کے لیے ناگزیر ہے۔ اس طرح اس نظریہ کے مطابق حکومت کے جواز واستحقاق کے لیے دو ضمانتیں موجود ہیں: ایک ایجابی اور دوسری سلبی۔ موخر الذکر ضمانت کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کوئی ایسا قانون نہ بنا سکے نہ کوئی ایسا فیصلہ لے سکے جو اپنی شکل و

صورت میں ملکی دستور سے ہم آہنگ نہ ہو اور ایجابی ضمانت سے مراد یہ ہے کہ حکومت ان فیصلوں اور قوانین کی تشکیل و نفاذ میں معاشرہ کی اعلیٰ قدروں کی بھرپور رعایت کرے۔ ان اقدار و اہداف کے پاکیزہ اور بلند تر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی رسائی اور گرفت پورے قانونی نظام پر ہو اور دستور سے ان کا مقام و مرتبہ بلند ہو بلکہ وہ خود دستور کا ہدف اور اس کی منزل مقصود کا درجہ رکھتی ہوں۔ تاہم قانون کی حکمرانی کے اس نظریے میں یہ سوال پھر بھی موجود رہتا ہے کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ حکومت اور حزب اقتدار ان اعلیٰ اہداف و اقدار کا التزام کرے گی اور ریاست کے قانونی نظام سے ماوراء ان فلسفیانہ نظریات کی رعایت رکھ پائے گی؟ یعنی حکومت کس طرح ایجابی ضمانتوں کے لیے ان کے دقیق و لطیف مضمرات کے ساتھ جواب دہ رہے گی؟

عوامی حقِ مزاحمت

مفکرین سیاست نے اس سوال کا جواب دیا ہے عوام کو حقِ مزاحمت عطا کر کے۔ مغربی علماء کا نکتہ نظر یہ ہے کہ اگر معاشرہ کے اعلیٰ اہداف و اقدار کے خلاف حکومت کوئی قانون بناتی یا اقدام کرتی ہے اور اس کے اندر نظریاتی فساد رونما ہوتا ہے اور وہ فلسفۂ حیات سے انحراف کرتی ہے تو اس کا خالصۃً سیاسی حل موجود ہے اور وہ یہ کہ ایسی حکومت کے خلاف اس کے شہریوں کو مزاحمت کرنے کا بنیادی حق حاصل رہے گا مگر یہ حق مغرب کے دستوری نظام کی تشریحات کے مطابق سیاسی ہوگا جس کی ملکی دستور میں اجازت نہ ہوگی بلکہ معاصر تمام دساتیر اس طرح کی عوامی مزاحمت کو قابل سزا جرم تصور کرتے ہیں جو معاشرہ کے امن و امان اور اس کی سلامتی کے لیے خطرناک ہے۔

یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ مغرب کی سیاسی تاریخ میں ایسے دستوری وثائق اور دستاویزات موجود ہیں جن میں عوام کے حقِ مزاحمت کو تسلیم کیا گیا ہے اور حکومتوں کے اس انحراف کے مقابلہ میں عوامی ردعمل اور احتساب کی تصویب کی گئی ہے جیسے حقوق انسانی کا اعلامیہ جو فرانسیسی انقلاب

۱۷۸۹ء کے دوران جاری ہوا اور ۱۷۹۱ء کے فرانسیسی دستور کا حصہ بنا۔ حکمران دستاویزات کی حیثیت محض سفارشات کی رہی اور ایسے وسائل کی تنظیم نہ کی جا سکی جن سے اس حق مزاحمت کو قانونی استحقاق و جواز مل پاتا۔ یہ حق ایک خالص فلسفیانہ نظریہ کی شکل میں موجود رہا اور اس کی طول طویل تشریحات ہوتی رہیں۔ جیسے جان لاک[۴] (John Locke) کا نظریۂ انقلاب ہے۔ یہ نظریہ اس کی علم سیاست پر کتاب 'حکومت پر دو مقالات' (Two Treatises of Government) میں شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

جان لاک کا نظریۂ انقلاب

جان لاک کتاب کے پہلے مقالہ میں 'بادشاہوں کے الہامی حقوق' کے نظریہ پر سخت تنقید کرتا ہے۔ یہ نظریہ سترہویں صدی کے وسط میں رابرٹ فلمر نے اپنی تصنیف Patriarcha میں شدو مد سے پیش کیا تھا اور بادشاہوں کی غیر مشروط اطاعت کو الہامی قرار دیا تھا۔ دوسرا مقالہ حکومت و ریاست کے آمرانہ اور مطلق العنان نظریہ کی مدلل تنقید پر ہے۔

جان لاک کے نظریہ کے مطابق سیاسی اقتدار نام ہے قانون سازی کا اور قوانین کو معاشرہ میں عوامی طاقت استعمال کر کے نافذ کرنے کا۔ حکومت ایک امانت ہے جو مصالح عوام کے تحفظ کے لیے حکمراں کے سپرد کی جاتی ہے۔ حکمراں کا اقتدار مطلق العنان نہیں مشروط ہے۔ فرد جب ایک شہری معاشرہ کی رکنیت اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے تمام حقوق سے بالکلیہ دست بردار نہیں ہو جاتا۔ قدرت نے انسان کو بے بہا وسائل سے نوازا ہے وہ ان وسائل کو اپنی محنت کے ذریعہ کام میں لاتا ہے اس لیے ہر فرد کا حق ملکیت ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ ہر فرد کو بجا طور پر یہ امید رکھنے کا حق ہے کہ حکومت اس کے حق ملکیت کو تسلیم کرے گی اور اس کی جائیداد اور مقبوضات کی حفاظت کرے گی۔ ہر فرد فکری آزادی، تحریر و تقریر کی آزادی اور آزادیٔ عبادت کا سزاوار ہے۔ وہ شہری معاشرہ کی رکنیت اختیار کرتے وقت بس ایک حق سے دست بردار ہوتا ہے اور وہ ہے فیصلہ کرنے اور دوسرے

انسانوں کو سزا دینے کا حق۔ جان لاک کے بقول، وہ ''قانون فطرت کے نفاذ کی قوت کو ترک کرتا اور اسے عوام کے حوالہ کر دیتا ہے۔'' وہ خود اپنے اوپر شہری قانون کو نافذ کرتا اور رضا کارانہ اطاعت میں اپنی آزادی کو محسوس کرتا ہے۔ اس آزادی کے تحفظ کے لیے جان لاک نے ایک مخلوط دستور کا تصور دیا جس میں قانون ساز یہ منتخب کردہ ہے اور انتظامیہ فرد واحد یعنی بادشاہ کی ذات میں سمٹ گئی ہے۔ وہ قانون سازی اور انتظامیہ کے اختیارات کی تفریق کا وکیل اور ترجمان ہے۔ اس کی نگاہ میں مقتدر اعلیٰ حتمی طور پر عوام ہیں اور انہیں ہمیشہ یہ حق حاصل ہے کہ حکومت کی تائید سے دست کش ہو جائیں اور حکومت کا تختہ پلٹ دیں اگر وہ عوامی امانت کی ذمہ داری کی ادائیگی میں ناکام ہے۔[۵]

شہریوں کے حق انقلاب کا یہ نظریہ جان لاک کے مطابق درج ذیل حالات میں قابل قبول ہے:

۱۔ جب معاشرہ میں انصاف کا جنازہ نکل جائے اور افراد کے حقوق مسخ کر دیے جائیں۔

۲۔ جب حکومت افراد کے حق اکتساب کو غصب کرے اور ان کی جائیداد پر قابض ہونے کے اقدامات کرنے لگے۔

۳۔ جب مقننہ اور انتظامیہ حق زندگی، حق جائداد اور آزادی کی صریحاً خلاف ورزی کرنے لگے۔

جان لاک کا نظریۂ انقلاب مسلح و غیر مسلح ہر اقدام کی گنجائش نکالتا ہے اور حکومت کو معاشرہ کے اعلیٰ اہداف واقدار پر ڈاکہ ڈالنے سے روکنے کے لیے تمام وسائل اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس نظریہ پر مفکرین نے بحثیں تو بہت کی ہیں مگر ان سب کی حیثیت محض اس فلسفہ اور نظریہ کی متنوع تشریحات کی رہی۔ اس نظریہ کو مغربی مفکرین اور دانشوروں نے بالعموم مسترد کر دیا ہے۔

جان لاک کے اس فلسفہ کے علاوہ مغربی سیاسیات کی تاریخ میں ہمیں کوئی ایک ملکی دستور بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں مخصوص حالات میں حکومت کے خلاف اقدام کی اجازت دی گئی ہو اور ملکی

قانون کے نظام سے اوپر اٹھ کر انقلاب برپا کرنے کو سند جواز عطا کیا گیا ہو۔ مغرب کی اس سیاسی فکر نے عوام کے حق انقلاب کی مخالفت میں اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی مفکر اور دانشور جان جاک روسو[۶] (Jean- Jacques Rousseau) کے نظریہ معاہدہ عمرانی (Social Contract Theory) سے استدلال کیا ہے۔

روسو کا معاہدۂ عمرانی

روسو نے ۱۷۵۵ء میں اپنی سیاسی تصنیف Discourse on the Origin of Inequality ترتیب دی اور ثابت کیا کہ عدمِ مساوات اور نابرابری دو طرح کی ہوتی ہے: فطری اور مصنوعی۔ قوت، ذہانت اور دوسری صلاحیتوں میں پیدائشی فرق کی بنا پر فطری طور سے افراد یکساں نہیں ہوتے مگر مصنوعی نابرابری پیدا کی جاتی ہے اُن روایات کے ذریعہ جن کی معاشرہ پر حکمرانی ہوتی ہے۔ یہاں روسو انسان کی فطری ہیئت سے بحث کرتا ہے جبکہ وہ انفرادی طور پر صحت مند، خوشحال اور آزاد تھا۔ آپس میں اختلافات اُس وقت شروع ہوئے جبکہ انسان نے معاشرہ کی تشکیل کا ارادہ کیا اور اجتماعی زندگی گزارنے کی ضرورت محسوس کی۔ مدنیت اور شہریت پسندی کے رجحان نے پڑوسی سے مسابقت اور رقابت کے جذبات بیدار کیے۔ انسانوں نے اپنے مفادات، وقار اور عزت نفس کی رعایت کے مطالبے کیے اور ان کے معصوم جذباتِ محبت میں فخر و غرور کے عناصر شامل ہو گئے۔ جائداد کے تحفظ کی ضرورت نے قانون اور حکمرانی کی ضرورت محسوس کی۔ اس طرح فرد فطری حالت میں خوش تھا اور یہی منصفانہ صورت حال تھی۔ تاہم حالات کے ارتقا نے جب اسے رقابت اور باہمی آویزش کی طرف دھکیل دیا تو اس نے دوبارہ اپنی آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد شروع کی۔ اسی مرحلہ کی تشریح کے لیے روسو نے ۱۷۶۲ء میں معاہدۂ عمرانی کا نظریہ پیش کیا اپنی غیر معمولی کتاب The Social Contract میں۔

معاہدۂ عمرانی کا آغاز روسو نے درج ذیل جملہ سے کیا:

"Man was born free but he is everywhere in chains."

''انسان آزاد پیدا ہوا تھا مگر آج وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے!''

ضرورت ہے کہ ان زنجیروں سے انسان کو آزاد کرایا جائے۔ اگر ایک متمدن معاشرہ یا ریاست معقول عمرانی معاہدہ پر استوار ہوتی اور مصنوعی نابرابری کا ماحول پیدا نہ کیا گیا ہوتا۔ جس کی طرف روسو نے نابرابری کے آغاز کے اسباب پر مشتمل اپنی تصنیف Discourse on the Origin of Inequality میں کیا تھا۔ تو افراد نے اپنی آزادی سے دست برداری کے عوض بہتر قسم کی حریت یعنی صحت مند سیاسی حریت اور جمہوریت کی نعمت حاصل کی ہوتی اس طرح کی سیاسی حریت روسو کے خیال میں، خودساختہ قانون کی اطاعت اور فرمانبرداری سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

ارادۂ عامہ کا تصور

روسو کے نظریہ سیاسی آزادی کا حصول اس وقت ممکن ہوگا جبکہ معاشرہ کے تمام افراد اپنی انفرادی رائے اور ارادہ سے دست بردار ہو کر ارادۂ عامہ (General Will) کو تسلیم کر لیں۔ روسو نے شہری معاشرہ یا ریاست کی تعریف ایسے مصنوعی فرد سے کی ہے جو ارادۂ عامہ سے پوری طرح متفق اور متحد ہے۔ معاہدۂ عمرانی، جو اس ریاست کو وجود بخشتا ہے، ایک عہد اور میثاق ہے اور معاشرہ وہ ہیئت ہے جس نے اس میثاق کو بخوشی تسلیم کیا ہے۔ روسو کی جمہوری حکومت تخلیق کردہ ہے ارادۂ عامہ کی۔ ایک ایسی رضا کی جو عوامی مفاد، مشترک مصلحت یا قومی منفعت کو تقویت پہنچانے کی شکل میں ہر فرد کے اندر ظاہر ہوتی ہے، خواہ اس کا تصادم بسا اوقات شخصی اور ذاتی مفاد سے ہو جائے۔

روسو تھامس ہابس (۱۵۸۸-۱۶۷۹ء) کی طرح مدلل گفتگو کرتا ہے کہ فرد جب ایک معاہدہ کے تحت شہری و تمدنی معاشرہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنے کو اور اپنے تمام حقوق کو اجتماعیت کے حوالہ کر دیتا ہے تاہم روسو کا زور اس پر ہے کہ افراد فطری حقوق سے اس لیے دست بردار ہوتے

(Powers) ہیں جن کا مصدر عوام ہیں اور حاکمیت اُن کے واسطہ سے منتخب نمائندوں کو منتقل ہوگئی ہے جبکہ روسو اپنے معاہدہ عمرانی کے نظریہ کے تحت براہ راست حاکمیت جمہور کا قائل ہے اور یہ حاکمیت نا قابل تغیر ہے اور نا قابل انتقال۔ گویا اس نظریہ سے تفویض اختیارات کا تصور باطل ٹھہرتا ہے اور پارلیمان کی معرفت حاکمیت جمہور کی نمائندگی غلط قرار پاتی ہے۔ روسو کے نزدیک حاکمیت نام ہے ارادۂ عامہ کے ظہور و نفاذ کا۔ اور ارادۂ عامہ خود ظہور کرتا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں یا تو ارادۂ عامہ کا ظہور و نفاذ ہوگا یا اس کا ظہور و نفاذ نہیں ہوگا۔ درمیان کی کوئی تیسری صورت روسو کے ہاں قابل قبول نہیں ہے اس لیے قوم کے نمائندے ارادۂ عامہ کے حقیقی ترجمان نہیں ہو سکتے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ نائب سمجھا جاسکتا ہے اور بس۔ اسی لیے روسو کہتا ہے کہ انگریز قوم اپنے کو آزاد کہتی ہے مگر وہ آزاد نہیں ہے۔ اس کی آزادی بس انتخابات کا عمل مکمل ہونے تک رہتی ہے۔ جہاں پارلیمان کا انتخاب مکمل ہوا وہ پھر دور غلامی میں واپس چلی جاتی ہے۔

جان لاک اور جان جاک روسو کے نظریات میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو حقیقت یہ ہے کہ معاصر مغربی سیاسی تنظیموں اور اداروں اور ان کے مفکرین اور دانشوروں کا حاکمیت جمہور کے اصول پر اتفاق ہوگیا ہے اور وہ اسے سلطنت و ریاست کی تشکیل کا اساسی عنصر تسلیم کرتے ہیں۔ آج کی مغربی جمہوریت پارلیمان اور اس کے منتخب کردہ اراکین کو عوام کا نمائندہ اور اس کا ترجمان تصور کرتی ہے اور یہ نظریہ اب مسلم ہوگیا ہے کہ مغربی جمہوریت پارلیمان اور اس کے منتخب کردہ اراکین کو عوام کا نمائندہ اور اس کا ترجمان تصور کرتا ہے اور یہ نظریہ اب مسلم ہوگیا ہے کہ اراکین پارلیمان انتخاب کے بعد محض اپنے حلقۂ انتخاب کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ ارادۂ عامہ کی ترجمانی کرتے ہیں اس لیے انتخاب کے بعد وہ اپنے مخصوص حلقہ کو جوابدہ نہیں ہیں۔ بلکہ ارادۂ عامہ کو جواب دہ ہیں اور پارلیمان کی مقررہ مدت سے پہلے انہیں ان کی رکنیت سے سُبک دوش نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح عملی طور پر اراکین پارلیمان اور انتخاب میں حصہ لینے والے عوام کے درمیان انتخاب کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا اور وہ منتخب حکومت کی محض رعایا

بن کر رہ جاتے ہیں۔ پارلیمان کی مقررہ مدت میں اراکین حکومت آزاد ہوتے ہیں اور عوام کی نگرانی واحتساب سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور یہ بنیادی سوال پھر آ کھڑا ہوتا ہے کہ حاکمیت جمہور کا نظریہ سیاسی مسئلہ کو حل کرنے میں کتنا کامیاب ہے۔ اور حکومت کی استبدادی ذہنیت اور حکام کی مطلق العنانی پر قدغن کیسے لگ سکتی ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اس حقیقت کو کتنے خوبصورت طریقے سے بیان کیا تھا:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایاتِ حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الأماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری [8]

حاکمیت جمہور کا نظریہ ایک ماہر سیاسیات کے الفاظ میں ''ارادۂ عامہ کی ایک تخیلاتی حکومت کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرز حکومت میں زندہ بادشاہ کی جگہ ایک خیالی حکومت ارادۂ عامہ کے نام سے وجود میں آتی ہے۔ یہ ارادہ اپنی فطرت کے اعتبار سے دوامی نہیں ہوسکتا کیوں کہ اسے براہ راست حکومت کرنے کا موقع نہیں ملتا اور کسی فرد یا افراد کے مجموعہ کا محتاج ہوتا ہے کہ اس ارادہ کا اظہار کرے اور اس میں نااہل لوگوں کے تخت حکومت پر متمکن ہونے کے امکانات سب سے زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی رائے اور فیصلے کو مسترد کرنا محال ہوجاتا ہے کیوں کہ وہ ارادۂ عامہ کی ترجمان کرتے ہیں اور ارادۂ عامہ کے بارے میں مغرب کی حتمی رائے ہے کہ اس سے غلطی نہیں ہوتی نہ اس سے ظلم وجور کا صدور ہوتا ہے۔'' [9]

Powers) ہیں جن کا مصدر عوام ہیں اور حاکمیت اُن کے واسطہ سے منتخب نمائندوں کو منتقل ہوگئی ہے جبکہ روسو اپنے معاہدہ عمرانی کے نظریہ کے تحت براہ راست حاکمیت جمہور کا قائل ہے اور یہ حاکمیت نا قابل تغیر ہے اور نا قابل انتقال۔ گویا اس نظریہ سے تفویض اختیارات کا تصور باطل ٹھہرتا ہے اور پارلیمان کی معرفت حاکمیت جمہور کی نمائندگی غلط قرار پاتی ہے۔ روسو کے نزدیک حاکمیت نام ہے ارادۂ عامہ کے ظہور و نفاذ کا۔ اور ارادۂ عامہ خود ظہور کرتا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں یا تو ارادۂ عامہ کا ظہور و نفاذ ہوگا یا اس کا ظہور و نفاذ نہیں ہوگا۔ درمیان کی کوئی تیسری صورت روسو کے ہاں قابل قبول نہیں ہے اس لیے قوم کے نمائندے ارادۂ عامہ کے حقیقی ترجمان نہیں ہو سکتے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ نائب سمجھا جا سکتا ہے اور بس۔ اسی لیے روسو کہتا ہے کہ انگریز قوم اپنے کو آزاد کہتی ہے مگر وہ آزاد نہیں ہے۔ اس کی آزادی بس انتخابات کا عمل مکمل ہونے تک رہتی ہے۔ جہاں پارلیمان کا انتخاب مکمل ہوا وہ پھر دور غلامی میں واپس چلی جاتی ہے۔

جان لاک اور جان جاک روسو کے نظریات میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو حقیقت یہ ہے کہ معاصر مغربی سیاسی تنظیموں اور اداروں اور ان کے مفکرین اور دانشوروں کا حاکمیت جمہور کے اصول پر اتفاق ہو گیا ہے اور وہ اسے سلطنت و ریاست کی تشکیل کا اساسی عنصر تسلیم کرتے ہیں۔ آج کی مغربی جمہوریت پارلیمان اور اس کے منتخب کردہ اراکین کو عوام کا نمائندہ اور اس کا ترجمان تصور کرتی ہے اور یہ نظریہ اب مسلم ہو گیا ہے کہ مغربی جمہوریت پارلیمان اور اس کے منتخب کردہ اراکین کو عوام کا نمائندہ اور اس کا ترجمان تصور کرتا ہے اور یہ نظریہ اب مسلم ہو گیا ہے کہ اراکین پارلیمان انتخاب کے بعد محض اپنے حلقۂ انتخاب کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ ارادۂ عامہ کی ترجمانی کرتے ہیں اس لیے انتخاب کے بعد وہ اپنے مخصوص حلقہ کو جوابدہ نہیں ہیں۔ بلکہ ارادۂ عامہ کو جواب دہ ہیں اور پارلیمان کی مقررہ مدت سے پہلے انہیں ان کی رکنیت سے سُبک دوش نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح عملی طور پر اراکین پارلیمان اور انتخاب میں حصہ لینے والے عوام کے درمیان انتخاب کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا اور وہ منتخب حکومت کی محض رعایا

بن کر رہ جاتے ہیں۔ پارلیمانؔ کی مقررہ مدت میں اراکین حکومت آزاد ہوتے ہیں اور عوام کی نگرانی واحتساب سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور یہ بنیادی سوال پھر آ کھڑا ہوتا ہے کہ حاکمیت جمہور کا نظریہ سیاسی مسئلہ کو حل کرنے میں کتنا کامیاب ہے۔ اور حکومت کی استبدادی ذہنیت اور حکام کی مطلق العنانی پر قدغن کیسے لگ سکتی ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اس حقیقت کو کتنے خوبصورت طریقے سے بیان کیا تھا:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس ِ آئین و اصلاح و رعایات ِ حقوق
طبِّ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الأماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری [۸]

حاکمیت جمہور کا نظریہ ایک ماہر سیاسیات کے الفاظ میں ''ارادۂ عامہ کی ایک تخیلاتی حکومت کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرز حکومت میں زندہ بادشاہ کی جگہ ایک خیالی حکومت ارادۂ عامہ کے نام سے وجود میں آتی ہے۔ یہ ارادہ اپنی فطرت کے اعتبار سے دوامی نہیں ہوسکتا کیوں کہ اسے براہ راست حکومت کرنے کا موقع نہیں ملتا اور کسی فرد یا افراد کے مجموعہ کا محتاج ہوتا ہے کہ اس ارادہ کا اظہار کرے اور اس میں نااہل لوگوں کے تخت حکومت پر متمکن ہونے کے امکانات سب سے زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی رائے اور فیصلے کو مسترد کرنا محال ہوجاتا ہے کیوں کہ وہ ارادۂ عامہ کی ترجمان کرتے ہیں اور ارادۂ عامہ کے بارے میں مغرب کی حتمی رائے ہے کہ اس سے غلطی نہیں ہوتی نہ اس سے ظلم وجور کا صدور ہوتا ہے۔'' [۹]

مغرب کی سیاسی فکر پر اس مختصر بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حاکمیت جمہور کے نظریہ کو جدید ریاست کے ایک اساسی عنصر کی حیثیت میں تسلیم تو کر لیا گیا مگر عملی طور پر حاکمیت اور اقتدار عوام کی جگہ ایک مخصوص طبقہ کے ہاتھ میں چلا گیا اور اس طبقہ کی مطلق العنانی اور آمریت کو محدود کرنے والی کوئی چیز نہ رہی سوائے اس ملک کے قانونی نظام کے جو عوامی نمائندوں ہی کا وضع کردہ اور تشکیل شدہ تھا اس طرح معاشرہ کے اعلیٰ اہداف اور پاکیزہ اقدار کے خلاف خروج کرنے سے روکنے کے لیے عوام کے پاس کوئی طاقت نہ رہی اور وہ استبداد و آمریت کے اندیشوں میں ماضی کی طرح اب بھی مبتلا رہے۔

مغرب کی سیاسی تاریخ کے اس طائرانہ مطالعہ کے بعد آیئے ہم سر تھامس آرنلڈ کے افکار کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ جدید سیاسی افکار و نظریات کی عینک لگا کر انہوں نے کس طرح اسلام کے نظریۂ خلافت پر اشکالات قائم کیے ہیں جبکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔

سر تھامس آرنلڈ

سر تھامس واکر آرنلڈ (۱۸۶۴-۱۹۳۰ء) [۱۰] (Sir Thomas Walker Arnold) مشہور مستشرق اور ماہر تعلیم ۱۸/اپریل کو ڈیون پورٹ (انگلستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بالترتیب پلائی موتھ ہائی اسکول اور سٹی آف لندن اسکول میں حاصل کی۔ ۱۸۸۳ء میں میگڈالین کالج کی اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج تشریف لے گئے۔ تعلیم مکمل ہوئی تو ملازمت کی تلاش شروع ہوئی۔ قسمت نے یاوری کی۔ ۱۸۸۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ اپنی لیاقت، مرنجا مرنج شخصیت اور مشرقی تہذیب سے طبعی قربت کی بنا پر کالج کے اساتذہ میں ہر دل عزیز ہو گئے۔ مولانا شبلی نعمانی، مولانا عباس حسین اور مولانا خلیل احمد کی بطور خاص رفاقت اختیار کی۔ طلبہ کی فلاح و بہبود کے لیے انجمن الفرض قائم کی جو ڈیوٹی سوسائٹی کے نام سے معروف ہوئی۔ انہوں نے ۱۸۹۸ء تک علی گڑھ میں قیام کیا [۱۱]

اس کے بعد انڈین ایجوکیشن سروس کی ملازمت اختیار کی اور فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت میں گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہوئے۔ یہاں وہ مسلم اساتذہ اور طلبہ سے کافی مانوس ہو گئے اور اپنے متعارف حلقہ میں صوفی کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ علامہ محمد اقبال اس وقت طالب علم تھے وہ سر تھامس آرنلڈ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے ۱۸۹۹ء فلسفہ میں ایم اے آرنلڈ کی نگرانی ہی میں مکمل کیا۔[۱۲] ۱۹۰۴ء میں وہ لندن واپس گئے تاکہ انڈیا آفس لائبریری میں ملازمت کی اپنی نئی ذمہ داریوں کو نبھا سکیں۔

آرنلڈ کو تدریس و تحقیق سے فطری دلچسپی تھی اسی لیے وہ یونیورسٹی کالج لندن میں پروفیسر کے منصب پر مامور کیے گئے۔ لندن میں ہندوستانی طلبہ کی تعلیمی رہنما کے لیے انہیں جلد ہی تعلیمی مشیر کی ذمہ داری بھی دے دی گئی جسے انہوں نے ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک بحسن و خوبی نبھایا۔ لندن یونیورسٹی میں نو تشکیل شدہ شعبہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں عربی زبان و ادب کے پروفیسر کی نئی ذمہ داری انہیں جلد ہی دی گئی۔ انہوں نے برسوں اس زبان کی بڑی مہارت اور لیاقت کے ساتھ خدمت کی۔ ۱۹۳۰ء میں قاہرہ یونیورسٹی نے انہیں توسیعی خطبات کے لیے مدعو کیا۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ کے اس سفر میں قبرص، روڈس اور یروشلم میں بھی اقامت اختیار کی۔ ۹ رجون کو انگلینڈ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

آرنلڈ نے مشرقی علوم و فنون سے دلچسپی اور اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے شغف کا مظاہرہ آخر تک قائم رکھا۔ ان کی تصنیف و تحقیق کے موضوعات علوم مشرقیہ کے گرد طواف کرتے رہے۔ یہاں چند تحقیقات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ دعوتِ اسلام

The Preaching of Islam: A History of the Propagation of the Muslim Faith (1896)

یہ کتاب مصنف نے قیام علی گڑھ کے دوران مرتب کی ۱۸۹۶ء میں لندن سے اس کی اولین

اشاعت عمل میں آئی۔ اردو ترجمہ شیخ عنایت اللہ کے قلم سے ۱۹۷۲ء میں لاہور سے چھپا۔ اس کتاب نے باور کرایا کہ "اسلام کی تبلیغ و اشاعت تلوار سے نہیں بلکہ پُر امن تبلیغی جدوجہد سے ہوئی۔" ۱۹۱۳ء میں جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو مصنف نے "تصویر کے دوسرے رخ پر" بھی توجہ مرکوز کی اور وہ یہ کہ "اسلام کی جبری تبلیغ نے۔ جس کی قرآن میں ممانعت آئی ہے۔ مسلم توسیع پسندی میں جو کردار ادا کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

۲۔ میراثِ اسلام Legacy of Islam

اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ جسے فاضل مصنف نے الفریڈ گلیوم کے اشتراک سے مرتب کیا۔ یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں "یوروپ کی مصوری پر فن اسلامی کا اثر" مضمون آرنلڈ کا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ عبدالمجید سالک کے قلم سے لاہور سے ۱۹۶۰ء میں طبع ہوا۔

۳۔ احمد بن یحییٰ بن المرتضیٰ المعتزلہ، یہ امام شہرستانی کی کتاب الملل والنحل کا ایک منتخب کردہ باب ہے، جو انگریزی میں ضروری حواشی کے ساتھ ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔

۴۔ سواء السبیل اِلیٰ معرفۃ للمعرب والدّخیل، یہ کتاب ظفر الدین کے اشتراک سے تحقیق و تدوین کا اعلیٰ نمونہ ہے جو لیپزنگ سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ اسلامی عقیدہ (Islamic Faith) ۱۹۲۸ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

۶۔ ہسٹنگ کی Encyclopaedia of Religion and Ethics کی جلد ۹ (۱۹۱۷ء) میں Persecution کے موضوع پر، جلد دوم (۱۹۲۰ء) میں ہندوستان کے اولیاء اور شہداء کے موضوع پر، اور Toleration یعنی تحمل کے موضوع پر مقالات۔

۷۔ آرائے نکلسن کے اشتراک سے عجب نامہ کی تحقیق و تدوین کی جو لندن سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔

۸۔ یوروپ اور اسلام کے موضوع پر طویل مقالہ جو ایف ایس مارون کی مرتب کردہ کتاب Western Races and World میں شامل ہے۔ یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی سے ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی۔

۹۔ Survivals of Sasanian and Manichean Art in Persian Painting محاضرات کا یہ مجموعہ آکسفورڈ سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔

۱۰۔ Painting in Islam: A Study of the Place of Pictorial Art in Muslim Culture, 1928, Oxford.

۱۱۔ The Caliphate آکسفورڈ سے ۱۹۲۴ء میں طبع ہوئی۔ اس کا عربی ترجمہ دمشق سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ متعدد تصانیف اور علمی مقالات ہیں جو آرنلڈ نے رقم کیے اور ان سب کا موضوع مشرقی علوم وفنون اور روایات ہیں۔

آرنلڈ کی استعماری ذہنیت

علامہ اقبال نے سر تھامس آرنلڈ کے طویل شاگردی اختیار کی، ان کے علم وفن سے بڑا استفادہ کیا اور زندگی بھر استاد گرامی کے احسان مند رہے مگر ان کی استشراقی فکر اور استعماری ذہنیت کی کبھی تائید نہ کی۔ ۱۹۳۰ء میں جب استاد کے انتقال کی خبر علامہ اقبال تک پہنچی، تو سید نذیر نیازی فرماتے ہیں کہ:

''حضرت علامہ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور پھر سر جھکا کر چند لمحے خوب روئے۔

یوں ان کے دل کا بخار ہلکا ہوا تو فرمایا:

Iqbal has lost his friend and teacher!

'اقبال اپنے استاد اور دوست سے محروم ہو گیا!'

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اتنے گہرے روابط اور تعلق خاطر کے باوجود جب میں نے آرنلڈ کے مرتبۂ استشراق اور اسلام سے ان کی عقیدت کا ذکر چھیڑا تو فرمایا: ''اسلام! اسلام سے آرنلڈ کو کیا تعلق!'' میں نے کہا، جب کوئی شخص بہ تحقیق اور طالب علمانہ اسلام پر قلم اٹھاتا ہے تو اس سے یہی توقع ہوتی ہے کہ اسلام کے بارے میں اس کی رائے اچھی ہوگی، بلکہ وہ شاید خود بھی اس کی طرف مائل ہو جیسے نپولین یا گوئٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے پھر آرنلڈ تو دعوت اسلام بھی لکھ چکے ہیں۔ فرمایا: ''دعوت اسلام اور اس قسم کی کتابوں پر نہ جاؤ۔ آرنلڈ کی وفاداری صرف خاک انگلستان سے تھی۔ وہی ان کا دین تھا اور وہی ان کی دنیا۔ انہوں نے جو کچھ کیا انگلستان کے مفاد کے لیے کیا۔ میں جب انگلستان میں تھا تو انہوں نے مجھ سے براؤن کی تاریخ ادبیاتِ ایران پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی، لیکن میں نے انکار کر دیا، کیوں کہ مجھے اس قسم کی تصنیفات میں انگلستان کا مفاد کام کرتا نظر آتا تھا۔ دراصل یہ بھی ایک کوشش تھی ایرانی قومیت کو ہوا دینے کی، اس مقصد سے کہ ملت اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ مغرب میں فرد کی زندگی صرف ملک کے لیے ہے اور قومی وطنیت کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ ملک اور قوم دونوں کو ہر بات پر مقدم رکھا جائے۔ لہٰذا آرنلڈ کو مسیحیت سے غرض تھی نہ اسلام سے۔ بلکہ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو آرنلڈ کیا ہر مستشرق کا علم و فضل وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جو مغرب کی ہوس استعمار اور شہنشاہیت کے مطابق ہو۔ ان حضرات کو بھی شہنشاہیت پسندوں اور سیاست کاروں کا دست و بازو تصور کرنا چاہیے۔'' پھر علی بخش کو بلایا اور اسی وقت لیڈی آرنلڈ کو تعزیت کا تار بھیجا۔''[۱۳]

دعوتِ اسلام کے مغالطے

آرنلڈ کی یہ استعماری ذہنیت خود ''دعوت اسلام'' کے بین السطور سے ظاہر ہوتی ہے۔ کتاب کی ترتیب کا مقصد بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں مذہب کی تبلیغ کے لیے جبر واکراہ کی سخت ممانعت آئی ہے[۱۴] اور مختلف آیات میں پُرامن تبلیغ کی تاکید ہے۔اس لیے یہ کتاب تبلیغ اسلام کی تاریخ ہے۔[۱۵] اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ تبلیغ دین کے اس قرآنی تخیل کو تاریخ اسلام میں عملی صورت کس طرح دی گئی۔اس کے بعد مصنف کہتے ہیں:

> ''ناظرین کرام کو یہ بات ابتدا ہی سے بخوبی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ کتاب اس جبر واکراہ کی تاریخ نہیں ہے جس کا بعض مسلمانوں نے ارتکاب کیا، بلکہ یہ اسلامی مشن کی تاریخ ہے۔لہٰذا اس تالیف کی غرض وغایت یہ نہیں کہ اسلام کی جبری اشاعت کی جو مثالیں اسلامی تاریخوں میں جابجا پائی جاتی ہیں ان کو قلمبند کیا جائے۔یورپ کے مصنفین نے ایسی مثالوں پر اس قدر زور دیا ہے کہ ان کے فراموش ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔اور اگر بنظر غور دیکھا جائے تو دعوت اسلام کی تاریخ میں ان کا کوئی ذکر نہیں آسکتا۔مثلاً مسیحی مشن کی تاریخ میں ہم قدرتی طور پر اس بات کی توقع رکھیں گے کہ سینٹ لیوڈگر (St. Luidger) اور سینٹ ولہڈ (St. Willehad) کی کوششوں کا زیادہ ذکر آئے جو انہوں نے بت پرست سیکسن قوم کو عیسائی بنانے میں صرف کیں۔بہ نسبت اُن بپتسموں یعنی اصطباغوں کے جو شہنشاہ شارلمین نے اس قوم کو بنوک شمشیر دیے۔''[۱۶]

مسلمانوں نے تبدیلیٔ مذہب کے لیے جبر واکراہ کا سہارا کب لیا، جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ماخذ کے طور پر غیر مسلم یورپی مصنفین کی کتابوں اور ان کے بیانات کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی حیثیت صلیبی ذہنیت کے اظہار کے سوا کچھ نہیں۔آگے چل کر آرنلڈ عیسائیت کی مشنری تاریخ کا تذکرہ کرتے ہیں جبکہ شاہ اولاف (Olaf)

(Trygverson نے ملک ناروے کے جنوبی خطہ دکن کے باشندوں کو عیسائیت قبول نہ کرنے کے جرم میں قتل کرادیا یا سینٹ لوئس نے اپنے معتقدین کو تشدد پر ابھارا۔ اس کے بعد آرنلڈ مسلم تاریخ کا حوالہ دیتے ہیں:

> ''بعینہٖ اسی طرح اہل اسلام میں بھی ایسے مبلغین گزرے ہیں، جنھوں نے تبلیغ دین میں صرف پُر امن وسائل اختیار کیے ہیں، اور اموی خاندان کے آخری حکمراں مروان کے اس وحشیانہ مقولے کو اپنے لیے مشعل راہ نہیں بنایا جس نے بقول عیسائی مورخ سویرس (Severus) کہا تھا کہ 'اہل مصر میں سے جو شخص میرے دین میں داخل نہیں ہوتا اور میری طرح عبادت نہیں کرتا اور میرے عقائد کی پیروی نہیں کرتا، میں اسے قتل کر کے سولی پر چڑھا دوں گا۔'' [۷]

یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل اسلام میں وہ کون سے مبلغین ہیں جنھوں نے پُر امن وسائل کے ساتھ دوسرے وسائل بھی استعمال کیے جن کے تذکرہ سے آرنلڈ صرف نظر کرنا چاہتے ہیں؟ مروان کے اس ''وحشیانہ مقولہ'' کا ماخذ کیا ہے؟ عیسائی مورخ سویرس! آرنلڈ نے اتنی بھیانک الزام تراشی کے لیے اصل مآخذ کا سہارا کیوں نہیں لیا؟ کیا یہ بات اتنی غیر اہم تھی کہ اس کی تحقیق کی ضرورت مصنف نے محسوس نہیں کی؟ اس طرح کے بہت سے مغالطے ہیں جن سے ''دعوت اسلام'' جیسی معروف ومقبول کتاب پُر ہے۔

خلافت کا سیاسی نظریہ

سر تھامس آرنلڈ کی معروف تصنیف The Caliphate ۱۹۲۴ء میں آکسفورڈ سے شائع ہوئی۔ یہ اُن محاضرات کا مجموعہ ہے جو مصنف نے یونیورسٹی آف لندن میں پیش کیے۔ خلافت اور مقدس رومن سلطنت، آغاز خلافت اور خلیفہ کے خطابات، قرآن اور احادیث میں خلافت کی مذہبی معتبریت، سلطنت عباسیہ کا تاریخی جائزہ، فقہاء کے مباحث و دلائل، گیارہویں سے

تیرہویں صدی تک عباسی خلافت کی مستند حیثیت، قاہرہ میں عباسی خلافت کا قیام و استحکام، عالم اسلام کے حکمرانوں سے قاہرہ کی عباسی خلافت کے تعلقات، آزاد مسلم حکمرانوں کا خلیفہ کے خطاب سے سرفراز ہونا، متکلمین وفلاسفہ کا نقطۂ نظر، خلافت عثمانیہ، مصر میں سلطان سلیم کی فرماں روائی، ہندوستان کے مغل بادشاہ، دورِ آخر کے عثمانی حکمراں اور خلافت، خلافت کے بارے میں شیعہ اور خوارج کے نظریات، خلیفہ کے مفروضہ روحانی اختیارات، لفظ خلیفہ کا عوامی استعمال، سلطان کا خطاب، عثمانی حکمرانوں کے خطابات و القاب وہ موضوعات ہیں جن سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ اس وقت کتاب کی تیسری فصل پیش نظر ہے جس میں آرنلڈ نے خلافت کے سیاسی مضمرات سے بحث کی ہے۔

کتاب کی تیسری فصل میں آرنلڈ قرآن و حدیث سے نظریۂ خلافت کے مذہبی استناد پر گفتگو کرتے ہیں اور یہ مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اقتدار کی توجیہ اور اس کے استحکام کے لیے اسلام کے ہر دو اساسی مآخذ کو استعمال کیا۔ قرآن و حدیث میں خلافت کا کوئی سیاسی نظریہ نہیں پایا جاتا یہ نظریہ فقہاء کے ذہن اور اسلامی نصوص کی من مانی تفسیر کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں نے خلیفہ کے منصب اور اس کے دینی و سیاسی اختیارات کی تشریح ارتکاز اقتدار کے لیے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"But just as the theologians and statesmen of medieval Europe appealed to the Bible in support of both papal and imperial claims, so the theologians and jurists of the Muslim world sought for some support of the political theory of the caliphate in the revealed word of God, and for them the authority of the Quran was a

matter of a still greater weight and importance, since by theory the Quran was the primary basis for law, both religious and civil."[18]

''لیکن جس طرح قرون وسطیٰ کے یوروپ میں مسیحی حکمرانوں اور ماہرین دینیات و الٰہیات نے اپنے مذہبی اور دنیاوی اقتدار کو استناد عطا کرنے کے لیے بائبل کو استعمال کیا اسی طرح مسلم دنیا کے متکلمین اور فقیہوں نے خدا کے الہامی الفاظ میں خلافت کے سیاسی نظریہ کی توجیہ تلاش کی۔ اُن کی نگاہ میں قرآن کی حیثیت اعتبار و استناد اور اہمیت کے اعتبار سے عظیم تر تھی کیوں کہ نظریہ کے اعتبار سے قرآن کریم کو مذہبی اور شہری قوانین کے لیے اساسی بنیاد کی حیثیت حاصل تھی۔''

آرنلڈ کا دعویٰ ہے کہ قرآن کریم کی متعدد آیات، جن میں خلیفہ/خلافت کی اصطلاح کا حوالہ دیا گیا ہے، اس سیاسی اختیار و اقتدار کی تشریح و تفسیر کے لیے موزوں نہیں ہیں جن کے دفاع میں علماء اور فقہاء نے انہیں نقل کیا ہے۔[19] مگر وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کم از کم دو آیات ایسی ضرور ہیں جو خلافت کی انفرادی ذمہ داری اور ایک ممتاز و متشخص شخصیت کا بیان اور اس کی صراحت کرتی ہیں۔ پہلی آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا حوالہ ہے اور دوسری میں حضرت داؤد علیہ السلام کے منصب خلافت اور اس کے تقاضوں کی صراحت ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۔(البقرہ:۳۰)

''پھر ذرا اُس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ ''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' انہوں نے عرض کیا: ''کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزیاں

کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں''
فرمایا: ''میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں جانتے۔''

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ ۔(ص:۲۶)

''اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے!''

پروفیسر آرنلڈ ان دونوں آیات کو نقل کرنے کے بعد شکوہ کرتے ہیں کہ ان کی تفسیر میں ضخیم و کبیر جلدیں تیار کی گئیں اور علمائے اسلام نے بالعموم ان سے مراد یہ لیا کہ خلیفہ کے معنی ہیں نائب، جانشین، قائم مقام جو کچھ عظیم فرائض کی نیابت کرے۔ علماء نے تشریح کی کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کو قرآن میں خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ وہ خلق خدا کی رہنمائی کرنے اور خدائی تنبیہات سے انہیں ہوشیار کرنے کے لیے زمین میں اللہ کے نائب بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آرنلڈ تبصرہ کرتے ہیں کہ:

It is obvious that such an interpretation could be employed to enhance the dignity and authority of the caliph.[۲۰]

''یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس طرح کی تفسیریں خلیفہ کی شوکت اور اس کے اقتدار کی توسیع کے لیے استعمال کی گئیں۔''

سیاسی اقتدار کے لیے احادیث سے استدلال

آرنلڈ کو یہ شکایت بھی ہے کہ خلافت کے سیاسی نظریہ کی صراحت و وضاحت کے لیے احادیث نبوی کا استعمال ناگزیر تھا چنانچہ ان احادیث نے نظریۂ خلافت کو مزید مستحکم کیا اسی لیے مسلم علماء اور فقہاء کی تحریروں میں ہمیں ان حدیثوں کے بکثرت حوالے ملتے ہیں۔ فاضل مصنف بڑے وثوق سے یہ فساد انگیز اور فتنہ پرور بیان دیتے ہیں:

" But there is no doubt that they were put forward in justification of the political institution that has gained acceptance with the main body of the faithful, and that the theory, in the main, grew of the facts, and represents the crystallization of opinion in the minds of the supporters of the Sunni Caliphate during the course of the first two centuries of the Mohammadan era."[۲۱]

"لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان احادیث نے اُس سیاسی ادارہ کی توجیہ و تاویل پیش کی جو امت کے سواد اعظم میں مسلم ہو گیا تھا، اور یہ کہ یہ نظریۂ (خلافت) بنیادی طور پر حقائق اور واقعات کے بطن سے نمودار ہوا، اور مسلمانوں کی ابتدائی دو صدیوں میں سُنی خلافت کے مؤیّدین کے دماغوں پر ایک مستحکم اور ثابت شدہ نظریہ کی حیثیت میں غالب رہا۔"

پروفیسر آرنلڈ مشہور حدیث الأئمّةُ من قريش بھی نقل کرتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

"The Caliphate thus recognised was a despotism

which placed unrestricted power in the hands of the ruler and demanding unhesitating obedience from the subjects."[۲۲]

''اس طرح مسلم معاشرہ میں تسلیم شدہ ادارۂ خلافت مطلق العنان اور استبدادی تھا جس نے حکمراں کے ہاتھ میں لامحدود اختیارات سونپ دیے اور رعایا سے بے حیل و حجت اطاعت اور فرماں برداری کا مطالبہ کیا۔''

آرنلڈ کے تجزیے کے مطابق اس اشرافی اور استبدادی اقتدار کی جڑیں ایرانی شہنشاہیت میں تلاش کی جاسکتی ہیں جس کی حدود میں مسلم حکمراں جا گھسے تھے۔ عرب اسلام سے پہلے کسی ایسے سیاسی ادارہ سے واقف نہ تھے نہ قرآن کی تعلیمات اس سے میل کھاتی تھیں کیوں کہ قرآن کی نگاہ میں تمام مسلمان یکساں مساوات کے حقدار تھے اسی طرح اولین خلفائے اسلام بھی اس استبدادی فکر سے نا آشنا تھے کیوں کہ ان کے ہاں آزادی تھی اور بدویانہ سادگی کی ان کے رویوں پر چھاپ تھی۔ مگر احادیث نے بقول آرنلڈ مسلسل تعلیم دی کہ قانونی اور شہری اطاعت واجب ہے اور اس اصول میں کسی مفاہمت کی گنجائش نہیں ہے۔

"For we now find an uncomprising doctrine of civil obedience taught in one Tradition after another."[۲۳]

''اس دور میں ہمیں شہری و مدنی فرماں برداری کا ایک غیر مصالحتی اصول کارفرما دکھائی دیتا ہے جس کی تعلیم احادیث یکے بعد دیگرے دیتی نظر آتی ہیں۔''

اس کے بعد مصنف نے کنز العمال سے دس احادیث حوالوں کے ساتھ نقل کی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ رعایا اپنے مسلم حکمرانوں کی اطاعت اور فرماں برداری کرے خواہ حکمراں کوئی فرد ہو۔ اور بعض احادیث میں یہاں تک تاکید کی گئی ہے کہ حکمراں کی اطاعت کرو خواہ وہ عادل ہو

یا ظالم۔ اس کے بعد آرنلڈ تبصرہ کرتے ہیں:

''اس طرح سیاسی نظریہ ان مضمرات پر تشکیل پایا کہ تمام دنیاوی اختیارات خدا کے متعین کردہ ہیں۔ عوام کا فرض ہے اطاعت کرنا، خواہ حکمراں عادل ہو یا ظالم، کیوں کہ ذمہ داری تمام تر صرف خدا کی ہے۔ عوام کو مطمئن رہنا چاہیے کہ اللہ ظالم حکمرانوں کو ان کے ظلم کی پاداش میں سزا دے گا اور انصاف پسند حکمرانوں کو وہ انعام سے نوازے گا۔'' [۲۴]

اطاعت مشروط ہے!

پروفیسر آرنلڈ نے ادارۂ خلافت کو مطلق العنان اور آمر محض ثابت کرنے کے جوش میں اُن صحیح احادیث سے بحث نہیں کی جن میں حکمراں کی مشروط اطاعت کی صراحت کردی گئی ہے اور شرح وبسط سے وضاحت کردی گئی ہے کہ اطاعت صرف معروف میں ہے۔ حکمراں اسی صورت میں مطاع اور فرماں برداری کے لائق ہے جبکہ وہ خود خدا اور رسول کا مطیع ہو۔ پیش ہیں چند احادیث:

''السّمعُ والطاعةُ علیٰ المرءِ المسلم فیما أحبَّ و کرہَ مالم یؤمَر بمعصیةٍ فإذا أُمر بمعصیةٍ فلا سمعَ و لاطاعةَ۔'' [۲۵]

''مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الأمر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے، اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اُسے نہ کچھ سننا چاہیے نہ ماننا چاہیے۔''

''لاطاعةَ فی معصیةٍ إنّما الطّاعةُ فی المعروفِ'' [۲۶]

''خدا اور رسول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے معروف میں ہے۔''

''یکون علیکم أمراء تعرفون و تنکرون فمن أنکر فقد برئَ ومن کرہَ فقد

سَلِم ولٰکن من رضی و تابع فقالُوا أفَلانقا تلُھُم؟قال لَاماصلُّوا۔''[۲۷]

''اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''ہم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ جس شخص نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بریٔ الذمہ ہوا اور جس نے اس کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔'' صحابہ نے پوچھا: جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم اُن سے جنگ نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔''

''شِرار أئمتِکُم الَّذِیْنَ تَبغَضُونَھُمْ وَیَبْغَضُونَکُمْ وتلعَنُونَھم وَیلعنونَکُم قلنا یارسولَ اللّٰہِ أفلا نُنَا بذھُم عِنْدَذالِك؟قال لاما أقا مُوافیکم الصّلوٰۃَ، لاما أقَا موافیکم الصّلوۃ۔''[۲۸]

''حضور ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لیے قابل نفرت ہوں اور تم اُن کے لیے قابل نفرت ہو۔ تم اُن پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔'' صحابہ کرام نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلہ پر نہ اٹھیں؟ فرمایا: ''نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔ نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔''

ایک اور حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ہم سے اس بات پر بیعت لی تھی کہ:

''أن لّاُنُنا زِعَ الأمرَاَھلَہٗ إلّا أن تَرو اکفراً بَواحًا عندکم من اللّٰہ فیہ برھانٌ۔''[۲۹]

''ہم اپنے حکمرانوں سے جھگڑا نہ کریں گے الاّ یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلا کھلا کفر دیکھیں جو ہمارے پاس ان کے خلاف اللہ کی طرف سے ایک دلیل ہو۔''

ان احادیث صحیحہ کو سر تھامس آرنلڈ کی نقل کردہ احادیث سے ملا کر دیکھا جائے تو اسلام میں حکمرانوں کی اطاعت اور فرماں برداری کا اصول پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ عام حالات میں رعایا پر واجب قرار دیا گیا ہے کہ وہ خلیفہ اور اولی الأمر کی اطاعت کریں۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں جو بھی سربراہ کار ہوں وہ اطاعت کے مستحق ہیں اور ان سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعیت کے خلاف خروج اور بغاوت کی اجازت اسلام نے نہیں دی ہے لیکن اگر حکمراں خود اللہ اور اس کے رسول کی معصیت کا کھلم کھلا ارتکاب کرنے لگیں تو ان کے خلاف جدوجہد کرنے کی اجازت ہوگی۔ یہ ہے وہ پس منظر جس میں خلیفہ اور اولوالأمر کی اطاعت سے متعلق احادیث کو دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے مگر ان احادیث صحیحہ کے مطالعہ سے سر تھامس آرنلڈ اپنی نظریہ کاری میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے اس لیے کنز العمال سے انہوں نے اپنے مطلب کی روایات لے لیں اور دوسری احادیث کو نظر انداز کر دیا۔

نیم دلانہ اعتراف

اسلامی خلافت کے سیاسی اختیارات اور قانونی و دستوری مضمرات پر سر تھامس آرنلڈ ایک طرف زبردست تحفظات کا شکار نظر آتے ہیں اور اس مقدس ادارہ کے تئیں یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مطلق العنانی، آمریت اور استبداد اس کے خمیر میں موجود تھا اور یہ کہ مسلم علماء اور فقہاء نے تنظیم و استحکام اور توسیع اقتدار کے لیے قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی افادی تشریحات کیں تو دوسری طرف دبے لفظوں میں وہ یہ تسلیم بھی کرتے ہیں کہ خلیفہ اسلامی تاریخ میں شریعت پر عمل کرنے کا پابند ہوتا تھا اور اس طرح اس کے سیاسی اختیارات پر ایک بندش ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ وہ آخر میں کہتے ہیں:

"In one respect only was the arbitrary,

autocratic power of the Caliph limited, in that he, just as every other Muslim, was obliged to submit to the ordinances of the Shariah, or law of Islam. This limitation arose from the peculiar character of Muslim law as being primarily (in theory atleast) derived from the inspired word of God, and as laying down regulations for the conduct of every department of human life, and thus leaving no room for the distinction that arose in Christendom between canon law and the law of the state.

The law being thus of divine origin demanded the obedience even of the Caliph himself, and theoretically atleast the administration of the state was supposed to be brought in to harmony with the dictates of the sacred law.[۳۰]

''بس ایک پہلو سے خلیفہ کا آمرانہ اور مستبدانہ اقتدار محدود تھا۔ وہ ہر مسلمان کی طرح احکاماتِ شریعت یا اسلامی قانون کو ماننے پر مجبور تھا۔ خلیفہ کی یہ محدودیت مسلم قانون کے خصوصی امتیاز کا دین تھی کیوں کہ شریعت بنیادی طور پر، کم از کم نظریاتی حد تک، خدا کے مقدس کلام سے ماخوذ تھی اور چونکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی تنظیم کے لیے قواعد وضوابط تشکیل دیتی تھی اور اس طرح اُس تفریق وتقسیم کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہ تھی

جو عیسائیت کی تاریخ میں کلیسائی قانون اور ریاستی قانون کے درمیان قائم ہوئی۔

قانون، اس طرح الہامی ہونے کی وجہ سے، اطاعت کا مقتضی ہوا یہاں تک کہ خلیفہ کی فرماں برداری کا بھی۔ اور کم از کم نظریاتی طور پر یہ مفروضہ قائم ہوا کہ تنظیم ریاست اور مقدس قانون کے احکامات کے درمیان توافق ناگزیر طور پر موجود ہے۔'' [۳۱]

آرنلڈ کی منہجی خامیاں

پروفیسر آرنلڈ نے اپنی اس نظری و تاریخی بحث میں دو نکات کے اثبات کے لیے زور قلم صرف کیا ہے:

۱۔ اسلامی خلافت ایک استبدادی اور آمرانہ حکومت تھی جس نے حکمراں کے ہاتھوں میں لامحدود اختیارات دے دیے تھے اور جس کی غیر مشروط اطاعت عوام پر فرض تھی۔

۲۔ خلافت کا سیاسی نظریہ اپنی فطرت اور تشکیل کے اعتبار سے مقدس اور الہامی قرار دیا گیا جس کی اطاعت ہر حال میں واجب قرار دی گئی خواہ حکمراں انصاف پسند ہو یا ظالم۔ [۳۲]

آرنلڈ کی فکری غلطی اور قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی صحیح تعلیمات سے ان کی بے خبری پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ان منہجی اور اصطلاحی غلطیوں کی نشاندہی کر دی جائے جن میں وہ مبتلا ہوئے اور تحقیق و بحث کی منہجی خامیوں نے انہیں غلط نتائج تک پہنچایا اور ایسے دعوے کرنے پر آمادہ کیا جو حقیقت سے بہت دور تھے۔

فاضل دانشور نے کتاب کی تیسری بحث یہاں سے شروع کی تھی کہ خلافت کے سیاسی نظریہ کے استناد کے لیے مسلم علماء اور فقہاء نے اسلامی شریعت کے اولین ماخذ کی حیثیت سے قرآن کریم کی طرف رجوع کیا۔ پھر آگے چل کر اسی فصل میں انہوں نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس سیاسی نظریۂ خلافت کی توضیح مزید کے لیے احادیث کی تفہیم و تشریح ان کے لیے ناگزیر ٹھہری۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی نظریہ (Political Theory) کا منہجی اور اصطلاحی مفہوم آرنلڈ کے

ذہن سے بالکل غائب ہے۔ اُن کی خلافت سے متعلق تمام تحریریں، جن کی بنیاد پر انہوں نے خلافت کے سیاسی نظریہ پر نقد و جرح کا فریضہ انجام دیا ہے، ہمیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ خلافت کا ایک سیاسی نظریہ پہلے تشکیل دیا گیا پھر علمائے اسلام نے قرآن وسنت کی مدد سے اسے معتبر و مستند قرار دیا اور اسلامی نصوص کی تشریح اس نظریہ سے مفاہمت و مطابقت کی خاطر کی گئی۔ سیاسی نظریہ کا جو منہجی و سیاسی مفہوم علمائے سیاسیات نے بیان کیا ہے اُس سے یہ تصور بالکل میل نہیں کھاتا۔

سیاسی نظریہ کا مفہوم

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے سیاسی فلسفہ یا نظریہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کا کلیدی مسئلہ یہ بتایا ہے کہ عوامی اقتدار کا استعمال یا اس کی تحدید کس طرح کی جائے کہ انسانی زندگی کی بقا کی ضمانت مل سکے اور اس کا معیار بلند ہو۔ انسانی تجربات کے تمام پہلوؤں کی طرح سیاسی نظریہ کے لیے بھی ناگزیر ہے ایک ماحول اور فہم کا دائرہ کار اور اس کی محدودیت۔ معاشرہ کے مختلف مسائل کا مفکرین اور فلاسفہ جو جواب دیتے ہیں وہ ان کے دور کے علم اور مفروضات کو منعکس کرتے ہیں اس طرح سیاسی نظریہ زیادہ فلسفیانہ اور نظریاتی ہوتا ہے بہ نسبت سیاسی اور انتظامی تنظیموں اور اداروں کے مطالعہ کے۔ اس کے بعد مقالہ نگار کہتا ہے کہ اصطلاح کا تعلق عام فلسفہ سے ہے اور یہ سماجی بشریات، عمرانیات اور علوم کی سماجیات سے زیادہ متعلق و مربوط ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "As a normative discipline it is thus concerned with what ought, on various assumptions, to be and how this/purpose can be promoted, rather than with a description of facts- although any realistic political theory is necessarily related to

these facts. The political philosopher is thus not concerned so much, for example, with how pressure groups work or how, by various systems of voting, decisions are arrived at, as with what the aims of the whole political process should be in the light of a particular philosophy of life."[۳۳]

''بحیثیت ایک معیاری علم وفن کے (سیاسی نظریہ کی اصطلاح) براہ راست اس سے متعلق ہو جاتی ہے کہ، متعدد مفروضات کے تئیں، کیا ہونا چاہیے اور کس طرح اس مقصد کی توسیع اور اس کا ارتقا ہوسکتا ہے، بہ نسبت حقائق اور واقعات کے بیانیہ کے۔ گرچہ کوئی بھی حقیقت پسندانہ سیاسی نظریہ لازمی طور پر ان حقائق سے مربوط ہوتا ہے۔ اس طرح ایک سیاسی فلسفی اور مفکر کو، بطور مثال، اس سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کہ مختلف پریشر گروپ کس طرح کام کرتے ہیں، مختلف انتخابی نظاموں کی فطرت اور ہیئت کیا ہے، فیصلے کس طرح کیے جاتے ہیں بلکہ اُس کو غرض اس سے ہوتی ہے کہ ایک مخصوص فلسفۂ حیات کی روشنی میں پورے سیاسی عمل کی ہیئت اور نظام کار کیا ہو۔''

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا فاضل مقالہ نگار، اس طرح، سیاسی فلسفہ ونظریہ اور جدید علم سیاست کے درمیان تفریق کرتا ہے۔ اس کے مطابق سیاسی فلسفہ مفکرین اور دانش وروں کے جہانی نظریہ سے بحث کرتا ہے اور ان کی تاریخی ترتیب وتنظیم کے ایک تحسینی پہلو کا تقاضہ کرتا ہے جبکہ علم سیاست تجربی اور بیانیہ ہے۔ مقالہ نگار کہتا ہے کہ سیاسی فلسفہ تاہم غیر عملی مفروضات ہی کا نام نہیں ہے، گرچہ اس سے اعلیٰ ترین غیر عملی اساطیر جنم لے سکتے ہیں، بلکہ یہ زندگی کی اہم ترین اور وسیع ترین جہت کا نام ہے اور اچھے یا بُرے فیصلہ کن ثمرات واثرات سیاسی عمل پر ڈالتا ہے، کیوں کہ ان

مفروضات ومزعومات کو جن پر سیاسی زندگی استوار ہوتی ہے، لازمی طور سے اُن حقائق وحالات پر اثرانداز ہونا چاہیے جو فی الواقع رونما ہوتے ہیں۔ [۳۴]

" Political philosophy may thus be viewed as one of the most important intellectual disciplines, for it sets standards of judgement and defines constructive purposes for the use of power. [۳۵]

''سیاسی فلسفہ یا نظریہ کو اس طرح بہت اہم علمی اور دانشورانہ فن کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے، کیوں کہ یہ فیصلہ لینے کے معیارات کی تعیین کرتا ہے اور استعمالِ قوت واقتدار کے لیے تعمیری مقاصد اور اہداف کی تحدید کرتا ہے۔''

سیاسی نظریہ کی اس تعریف وتحدید میں چند عناصر ترکیبی کی کلیدی اہمیت ابھر کر سامنے آتی ہے:

۱۔ متعدد مفروضات پر مطلوبہ معیارات اور مقاصد کی تحصیل مقصود اولین ہو اور حقائق اور واقعات سے بنیادی طور پر تعرض نہ کیا جائے۔ یعنی سیاست کے اعلیٰ اہداف اور بلند اقدار کا تخیلاتی وجود پہلے ہو اور عوامی قوت کا استعمال اُن اہداف واقدار کے حصول کے لیے ہو۔

۲۔ حالت موجودہ کے بیان واظہار کی بجائے حالت مطلوبہ پر گفتگو مرکوز ہو۔

۳۔ وہ تصور ایک جہانی نظریہ کو محیط ہو جو فلسفۂ حیات کو زیر بحث لاتا ہو۔

سیاسی نظریہ کے ان عناصر ترکیبی کو اسلام پر منطبق کیا جائے تو اسلام کا سیاسی نظریہ اس طرح تشکیل پاتا ہے کہ اس میں قرآن وسنت سے ماخوذ ومستنبط سیاست کی اعلیٰ اقدار واہداف کا مجموعہ ہے جو حالت موجودہ سے تعرض کرنے کی جگہ حالت مطلوبہ پر بحث کو مرتکز کرتا ہے اور اسلام کے تصور کائنات اور فلسفۂ زندگی کو محیط ہے یعنی اسلامی نظریۂ سیاست یا نظریۂ خلافت کے لیے ناگزیر

ٹھہرا کہ معاشرہ کے مسائل سیاسیہ سے متعلق افکار و تصورات کا ایسا مجموعہ ہو جو قرآن وحدیث سے ایماندارانہ استنباط واستخراج پر مبنی ہو۔ اگر پروفیسر آرنلڈ کے ذہن میں سیاسی نظریہ کی یہ تعریف واضح ہوتی تو اپنی کتاب میں طول طویل بحث کا مرکزی نکتہ اسے نہ قرار دیتے کہ استبداد و آمریت پر استوار خلافت کے سیاسی نظریہ کی توجیہ وتاویل اور توسیع واستناد کے لیے کتاب وسنت کی تشریح و تفہیم کی گئی اور اسلامی نصوص کا کردار اس استبدادی اور آمرانہ مظاہرہ کی تائید وتصویب کے سوا کچھ نہ تھا۔

آرنلڈ نے جو خلافت کی تصویر کشی اور تعریف کی ہے اس کا درحقیقت اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح اپنے منہجی واصطلاحی معنوں میں اسے نظریہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے یہ منہج اختیار نہیں کیا کہ آیات قرآن اور احادیث نبویہ کی روشنی میں اپنے مطالعہ کا آغاز کریں اور اُن اقدار وتصورات کا استنباط کریں جن سے معاشرہ کے سیاسی روابط کی تعیین ہو اور اس طرح وجود میں آنے والا سیاسی نظام اسلامی بن سکے۔ اس کے برعکس انہوں نے منہجی ترتیب الٹ دی۔ پہلے متعین اور مخصوص زمانے کی خلافت کی ایک ذہنی تصویر بنائی جو تخیلات پر مبنی تھی پھر انہوں نے اُس تصویر کے مطابق حال آیات واحادیث کا انتخاب کیا اور اس طرح ایک مخصوص نظریہ کاری میں کامیاب ہوئے۔

استبداد کے مضمرات

پروفیسر آرنلڈ کی دوسری منہجی خامی یہ ہے کہ انہوں نے بعض ایسی مخصوص سیاسی اصطلاحات استعمال کی ہیں جن کے لطیف معانی اور مضمرات سے یا تو وہ واقف نہیں ہیں اور غیر شعوری طور پر ان کا اطلاق ایسے تصورات پر کر دیا ہے جو اُن کے مافی الضمیر سے بہت پرے ہیں یا انہوں نے اسلام کی سیاسی فکر کی شبیہ بگاڑنے کی نیت سے ایسا کیا ہے۔

آغاز فصل میں ایک طرف ان کا دعویٰ ہے کہ خلافت کی سیاسی نظریہ کاری مطلق العنانی اور

استبداد کو سند جواز عطا کرنے کے لیے کی گئی تھی اور اس کے لیے قرآن وحدیث سے تائیدی شہادت فراہم کی گئی تھی[۳۶] جبکہ فصل کے آخر میں دبے لفظوں میں یہ اعتراف بھی کر لیا کہ خلافت کی شخصی حکومت ایک پہلو سے محدود تھی اور وہ یہ کہ خلیفہ بھی عام مسلمانوں کی طرح پابند شرع تھا۔[۳۷]

پروفیسر آرنلڈ نے خلیفہ کے سیاسی اختیار و اقتدار کو Despotism (استبداد)، Absolutism (آمرانہ حکومت) اور Autocracy (آمرانہ شخصی حکومت) سے تعبیر کیا ہے۔ علم سیاست میں ان تینوں اصطلاحوں کی تعریف جن تصورات کے جلو میں کی گئی ہے ان میں مطلق العنانی، آمریت، تحکم، تغلب اور خود مختاری بطور خاص اہم ہیں۔ ماہرین سیاسیات کے مطابق یہ ''وہ طرز حکومت ہے جس میں غیر محدود اور کلی طور پر مرتکز اختیارات اور آمرانہ اقتدار حکمراں کو سونپ دیا جاتا ہے۔ اس طرز حکومت کی روح اور اس کا جوہر یہ ہے کہ حکمراں کو قواعد و ضوابط کی پابندی سے، کسی ایجنسی کی بندش سے آزاد تصور کیا جاتا ہے خواہ وہ ایجنسی عدالت کی ہو یا قانون سازیہ ہو یا مذہبی، معاشی اور انتخابی ادارے ہوں۔ ان سب کی گرفت سے حکمراں بالاتصور کیا جاتا ہے۔'' انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں:

"..... the political doctrine, and practice of unlimited centralised authority and absolute sovereignty, as vested especially in a monarch. The essence of such a system is that the ruling power is not subject to regularised challenge or check by any other agency, be it judicial, legislative, religious, economic or electoral.[۳۸]

علم سیاست کی تاریخ بتاتی ہے کہ لوئیس چہاردہم نے، جس نے سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے آغاز میں فرانس میں بڑے طمطراق سے حکومت کی، مطلق العنانی اور

بدترین آمریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

I am the state.

''ریاست اور قانون خود میری ذات ہے۔''

سیاسی آمریت اور استبدادی حکومت اپنی مختلف شکلوں میں قدیم ترین زمانے سے چلی آرہی ہے۔ مگر یورپ کی جدید تاریخ نے جس آمریت کو متعارف کرایا وہ بڑی عبرتناک ہے۔ اس کا کردار بنیادی اعتبار سے سلطانی ہے اور یہ قرون وسطیٰ کے نظام کی تباہی کے بعد رونما ہونے والی نئی قومی ریاستوں کے طاقتور رہنماؤں کے رویہ پر انحصار کرتی ہے۔ ان ریاستوں کے اختیارات تمام تر ان کے حکمرانوں سے مخصوص ہو کر رہ گئے تھے اور ریاست اور حکمراں کو مضبوط اور توانا بنانے کے لیے ناگزیر تھا کہ اُن تمام بندشوں اور زنجیروں کو کاٹ دیا جائے جو چرچ، جاگیرداروں اور قرون وسطیٰ کی روایات و رسوم کی جانب سے ایک مرتکز اور مستحکم حکومت پر لگائی جاسکتی تھیں۔ اس طرح کی بندشوں کے خلاف ریاست کی آمرانہ اور خودمختار قوت کا اعلان کرتے ہوئے بادشاہوں نے اپنے آپ کو خودمختار اور مطلق العنان قرار دے دیا اور وہ بلاشرکت غیرے تمام سیاسی اختیار کے مالک بن بیٹھے۔

سولہویں صدی کی آمد سے شاہانہ مطلق العنانی اور آمریت مغربی یورپ میں اپنے پر پُرزے نکالنے لگی اور سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں اس طرز حکومت کی عمومی توسیع ہوگئی۔ فرانس کے علاوہ، جہاں لوئیس چہاردہم نے اپنی خودمختاری کا سکہ جمایا، اسپین، پروسیا اور آسٹریا بھی اس میدان میں پیچھے نہ رہے۔ شاہانہ خودمختاری کے دفاع میں سب سے مضبوط اور عوامی دلیل یہ دی گئی کہ بادشاہ کے اقتدار کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے یعنی بادشاہوں کے الہامی حقوق کا نظریہ (The Divine Rights of King) تراشا گیا۔ اور اس کے حق میں استدلال اس طرح کیا گیا کہ انسانی گناہوں کی پاداش میں ظالم اور مستبد حکمراں رعایا پر خدائی سزا کے طور پر مسلط کردیے جاتے ہیں۔ بادشاہوں کے الہامی حقوق کے نظریہ کی اصل اور اساس قرون وسطیٰ

کے اس تصور میں تلاش کی جا سکتی ہے کہ خدا بطور انعام سیاسی حکمراں کو دنیوی اقتدار عطا کرتا ہے اور رومن کیتھولک چرچ کے سربراہ کو روحانی اقتدار سے ہمکنار کرتا ہے۔ مگر قومی ریاست کے نئے سربراہوں نے تمام معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ دنیوی و روحانی تمام قوتیں اپنے اندر مرتکز کر کے وہ ریاست اور چرچ دونوں کے آقا بن گئے۔ انہیں مطلق العنان اور خود مختار اس حد تک تسلیم کر لیا گیا جو قرون وسطیٰ کے بادشاہوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔

مطلق العنانیت اور آمریت کے جواز میں یہ دلیل بھی دی گئی کہ فرد واحد کی مکمل اور غیر مشروط وفاداری اور فرماں برداری ریاست میں امن و قانون کی بحالی کے لیے اور عوامی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے برعکس صورت حال میں لاقانونیت رونما ہوتی ہے کیوں کہ سیاسی اقتدار تقسیم ہو جاتا ہے۔ ذاتی مفادات کی بنیاد پر رعایا کی حکومت کے تئیں کامل دست برداری کا اظہار سب سے زیادہ مدلل انداز میں سترہویں صدی کے مفکر تھامس ہابس کی کلاسیکی تصنیف Leviathan میں ہوا ہے۔ اقتدار میں کوئی شرکت یا اس پر کوئی بندش ان لوگوں کو سخت ناگوار لگتی ہے جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ سچائی اور حقانیت کے بارے میں ان کا علم قطعی طور پر درست ہے۔[۳۹]

سیاسی خود مختاری، مطلق العنانی اور آمریت کا جو مفہوم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جس پر علمائے سیاسیات کا اتفاق ہے، اسے ایک طرف اسلام کے تصور خلیفہ پر منطبق کیجیے اور دوسری طرف خلیفہ پر شریعت کی پابندی کا جو اعتراف انہوں نے نیم دلانہ طریقے سے کیا ہے اسے بھی سامنے رکھیے تو ان دونوں بیانات میں صریح تضاد دکھائی دیتا ہے۔ دونوں بیانات میں توافق اور تطابق کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اگر خلیفہ مستبد، مطلق العنان اور خود مختار تھا تو اس نے شریعت کی پابندی کیوں گوارا کی اور عام مسلمانوں کی طرح شریعت کے احکام کو بے چوں و چرا کیوں واجب الاطاعت تسلیم کیا؟ اور اگر اس نے شریعت کی پابندی عام مسلمانوں کی طرح اپنے اوپر بھی لازم ٹھہرائی اور زندگی کے جملہ مسائل میں بنیادی مآخذ سے رہنمائی حاصل کی تو اسے کس طرح مستبد، آمر مطلق اور خود مختار قرار دیا جا سکتا ہے؟

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

قانون کی حکمرانی اور اسلام

پروفیسر آرنلڈ کی منہجی خامیوں پر گفتگو کرنے کے بعد اس بحث میں اسلام کے موقف پر روشنی ڈالی جائے گی تاکہ معلوم ہو سکے کہ ریاست کے مغربی تصور کے تئیں اسلام کا نکتہ نظر کیا ہے۔ قانون کی حکمرانی، مغرب کے عددی معیارِ حق، رعایا کے حق مزاحمت اور حاکمیت جمہور جیسے اہم معاصر مسائل کو اسلام کس تناظر میں دیکھتا ہے اور اس سیاق میں اس نے کیا ہدایات فراہم کی ہیں۔ ان اسلامی مباحث سے پروفیسر آرنلڈ کے افکار کی خامیاں بھی خود بخود بے نقاب ہو جائیں گی۔

شخصی حکومت اور آمرانہ طرز فکر کو اسلام ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں کرتا۔ مغرب کی جدید سیاسی تاریخ سے ہزار برس پہلے اسلام کے دونوں اساسی مآخذ قرآن کریم اور احادیث نبویہ نے ہر قسم کے استبداد اور مطلق العنانی کی جڑ کاٹ دی تھی۔ اسلام نے حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو اللہ کے لیے مخصوص کیا اور مسلمانوں کی حکومت کو خلافت سے تعبیر کیا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے۔ حکومت کو لازماً اُس قانون خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا ہے جس کا ماخذ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہے۔[۴۰]

قرآن کریم میں یہ ہدایات متعدد آیات میں موجود ہیں:

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيـنَ آمَـنُـوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَـنَـازَعْـتُـمْ فِـي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا۔ (النساء:۵۹)

''اے لوگو! جو لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو

اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔" [۴۱]

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی مبارک احادیث میں اسلام کے اس اصل الاصول کو پوری صراحت سے بیان کر دیا ہے:

عليكم بِكتابِ اللّٰهِ، أَحِلُّوا حلالَهُ وَ حَرِّمُوا حرامَهُ۔ [۴۲]

"اللہ کی کتاب کی پیروی تم پر لازم ہے۔ جس چیز کو اس نے حلال کیا ہے اسے حلال سمجھو اور جسے اس نے حرام کیا ہے اسے حرام سمجھو!"

السَّمعُ والطَّاعةُ علىٰ المرءِ المسلم فيما أحبَّ و كَرِه ما لَم يؤمر بِمَعصيةٍ فإذا أُمِر بِمَعصِيةٍ فَلا سَمعَ و لَا طَاعَةَ۔ [۴۳]

"ایک مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ برضا و رغبت کرے یا کراہت کے ساتھ کرے، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اور اگر اُسے معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔"

ان اسلامی نصوص سے صراحت ہو جاتی ہے کہ حکمراں کی اطاعت اسی صورت میں واجب ہے جبکہ وہ معروف کا حکم دے رہا ہو، اگر وہ خود خدا اور رسول کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی پر اتر آیا ہے اور معصیت کا مرتکب ہو رہا ہے تو اس کی اطاعت واجب نہیں رہ جاتی۔ یعنی حکومت پابند ہے کہ اسلام کے اساسی مآخذ کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور قانون الٰہی سے بغاوت نہ کرے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اعتراف - گرچہ نیم دلی سے - پروفیسر آرنلڈ نے اپنی بحث کے آخر میں کیا تھا خلیفہ ہر حال میں عام مسلمانوں کی طرح شریعت کا پابند ہوتا تھا۔

معیار حق کمیت یا کیفیت

مغربی سیاسی فکر میں طرز حکومت خواہ کوئی ہو، معیار تعداد ہی رہا ہے جبکہ قرآن کریم نے

عددی معیار کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس نے ہانکے پکارے تعداد کے معیار کو باطل قرار دیا:

أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلاً ۔ (الفرقان:۴۴)

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔''

اس کے بعد قرآن نے صراحت بھی کر دی کہ علم اور تجربہ کو ہر حال میں برتری حاصل ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۔ (الزمر:۹)

''اِن سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔''

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَات ۔ (المجادلۃ:۱۱)

''تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا۔''

سیاسی و معاشرتی تمام معاملات میں قرآن نے ایمان اور علم کو قابل لحاظ قرار دیا نہ کہ محض تعداد کی قلت و کثرت کو۔ قرآن نے اسلامی طرز حکومت کو خلافت کا نام اسی لیے دیا ہے کہ مسلمان اللہ کے نائب ہیں مگر یہ نیابت پاپائیت اور بادشاہوں کے الہامی حقوق سے یکسر مختلف ہے۔ اسلامی نیابت کا یہ مقام کسی فرد واحد، خاندان یا کسی مخصوص طبقے کا حق نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ اور یہ جمہوریت عام رائے دہندوں کی رائے سے بنتی اور چلتی ہے مگر یہ مطلق العنان اور مختار مطلق نہیں ہے۔ اسلامی مجلس شوریٰ میں فیصلوں کی بنیاد رایوں کی کثرت یا اتفاق ہوتی ہے مگر قرآن و سنت کے نصوص حتمی اور قطعی ماخذِ علم یعنی وحی الٰہی ہونے کی وجہ سے شوریٰ کی بحثوں سے بالاتر ہوتے ہیں اس لیے یہ جمہوریت غوغائیت اور انارکی میں تبدیل نہیں ہو پاتی اور نہ ارادۂ

عامہ کے ظہور کے نام پر ریاست استبداد کی جلوہ گاہ بن سکتی ہے۔

سیاسی جواز کا نظریہ اور اسلام

اوپر گفتگو کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے کہ مغربی سیاسی فکر میں نظریۂ سیاسی جواز (Legitimacy) اور نظریۂ دستوریت و قانون کی حکمرانی میں خلط مبحث ہو گیا ہے ان کے ہاں حکومت کے قانون و دستور کے مطابق ہونے کا تقاضا صرف یہ ہے کہ ملک کے قانون کی حکمرانی کو تسلیم کرے اور حکومت کوئی ایسا فیصلہ یا اقدام نہ کرے جو ملک کے دستور کے خلاف ہو۔ حکومت کے قانونی و دستوری ہونے کے اس عمل میں خود حکومت کے وجود اور سند جواز و استحقاق پر کوئی سوال قائم نہیں کیا جاسکتا نہ اُن سیاسی اقدار اور اعلیٰ اہداف کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو معاشرہ کی روح اور اصل الاصول ہیں یعنی اُس معاشرہ کے سیاسی فلسفہ اور جہاں نظریہ کے مطابق حکومت کام کر رہی ہے یا نہیں، یہ سوال زیر بحث نہیں آتا، اور اگر معاشرہ کی اساسی اقدار اور اُس کے اعلیٰ اہداف مجروح ہو رہے ہیں تو حکومت کے خلاف عوامی مزاحمت کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ اسلام کا نکتہ نظر اس معاملے میں بالکل مختلف ہے۔

اگر علم سیاست کی جدید اصطلاحات میں گفتگو کی جائے تو اسلام میں قانون کی حکمرانی اور دستوری جواز کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ حکومت ملک کے دستور اور قانون کے مطابق کام کر رہی ہے بلکہ اس سے آگے یہ ایجابی ضمانت بھی موجود ہے کہ دستور سے بالاتر اسلام کے جو اعلیٰ مقاصد اور پاکیزہ اہداف ہیں اور اس کا جو فلسفۂ سیاست اور فلسفۂ حیات و کائنات ہے اس کی بدرجۂ اتم تحصیل ہو رہی ہے اور حکومت کو قانونی و دستوری ہونے کا سرٹیفکٹ بھی حاصل ہے اور سند جواز و استحقاق بھی۔ یعنی اسلامی حکومت کی اصطلاح اُسی حکومت پر منطبق ہوگی جو نظریۂ اسلام کے مطابق Legal بھی ہو اور Legitimate بھی۔ قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں دونوں پہلوؤں کی مکمل وضاحت و صراحت موجود ہے۔ اسلامی شریعت صرف یہ بیان نہیں کرتی کہ مسلمان فرد کے بحیثیت انسان ہونے کے یا بحیثیت شہری ہونے کے یا حکمراں کی حیثیت

میں کیا واجبات و فرائض ہیں اور اس کا مطلوبہ رویہ کیا ہے بلکہ اس سے آگے شریعت یہ بھی بتاتی ہے کہ اسلامی ریاست کے اعلیٰ اہداف اور اس کی پاکیزہ اقدار کیا ہیں اور ان کی تحصیل کی ضمانت فراہم کرتی ہے انہیں ملک کے قانون و دستوری نظام کا اس طرح حصہ بنا کر کہ وہ دستور کے مزاج، اس کی طبیعت و فطرت کا جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔ اور اگر اُن اہداف و اقدار کے خلاف بغاوت کی جائے تو اُس کی سنگینی و شدت ملک کے قانون و دستور کے خلاف بغاوت سے کسی طرح کم نہیں تصور کی جاتی اور دونوں بغاوتیں قابل سزا جرم مانی جاتی ہیں۔

فقہاء نے جو صراحت کی ہے اس سے یہ کھل کر واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا ہدف اپنے تمام اداروں اور تنظیموں کے ساتھ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے واضح خطوط و نقوش کی روشنی میں اسلامی معاشرہ قائم کرے اور اس معاشرہ کی تشکیل، فقہ اسلامی کی تعبیر کے مطابق، تخت سلطنت پر متمکن افراد کے لیے ''شرط ابتدائی بھی ہے اور شرط بقائی بھی۔''[۴۴] اسلامی ریاست کے لیے سند جواز و استحقاق (Legitimacy) یہ ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ قائم کرے اور اس کی بقا اور استحکام اس پر منحصر ہے کہ اسلامی معاشرہ مستحکم رہے اور فرد کے قانونی و دستوری فرائض اور معاشرہ کے اساسی اقدار و اہداف کے درمیان کوئی خط فاصل قائم نہ ہو۔

نہی عن المنکر کا حق

اسلام نے ریاست کی قانونی و دستوری حیثیت اور اس کے سند جواز کی معتبریت کے لیے ایجابی ضمانت فراہم کی ہے ہر فرد ریاست کے حق مزاحمت کو تسلیم کر کے اور اُسے اپنے قانونی نظام کا ناگزیر حصہ بنا کر۔ اسلام نے ظلم و جبر اور انحراف و تحریف کے خلاف مزاحمت کو ایک اہم اصول قرار دیا اور اس کی بھرپور تصویر کشی قرآن و سنت نے کی۔ نہی عن المنکر قرآن کریم کا ایک اساسی اصول ہے جو فرد کے حق مزاحمت کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ قرآن کریم کا واضح اعلان ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنكَرِ وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔ (آل عمران:۱۰۴)

''تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔''

بلکہ قرآن کریم نے اُمر بالمعروف و نہی عن المنکر کو براہ راست ایمان سے جوڑ دیا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّهِ ۔ (آل عمران:۱۱۰)

''دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

موخرالذکر آیت میں اُمر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ایمان باللہ سے جوڑ دیا ہے کہ ایمان کا اصل الاصول یہ ہے کہ معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے اور خیر امت کا منصب مسلمانوں کو نسل ونسب کی بنا پر نہیں بلکہ اس ذمہ داری کی ادائیگی پر عطا ہوا ہے۔ اس سے آپ سے آپ یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ اعلیٰ منصب صفات اور ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط ہے اگر اصلاح ورہنمائی اور مزاحمت ومخالفت منکر کی یہ ذمہ داری ادا نہ کی گئی تو مسلمان قوم بحیثیت مجموعی اس منصب سے محروم ہو جائے گی اور ہر فرد کے ایمان چھن جانے کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہے گا۔

اس آیت سے ایک اور اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، وہ یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہی معتبر ہے جو ایمان باللہ کے ساتھ ہو۔ منبروں اور اسٹیجوں سے خدا پرستی ودینداری کی تلقین اور برائیوں کے خلاف جہاد کے جو وعظ کھوکھلے سینوں سے نکلتے ہیں ان کی حیثیت وہی ہے جس کا ذکر قرآن نے علمائے یہود سے متعلق فرمایا ہے کہ:

أَتَـأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ ۔ (البقرہ:۴۴)

"تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟"[۴۵]

علمائے اسلام نے صراحت کی ہے کہ منکر سے روکنے کا جو شرعی حق ہر مسلمان کو حاصل ہے وہ محض حق نہیں ہے کہ اس کے استعمال کرنے یا نہ کرنے کا اسے آزادانہ اختیار ہے بلکہ وہ ایک واجب ہے جس کی ادائیگی ہر فرد مسلمان پر لازم ہے۔ فقہاء نے یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ منکر میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کی شریعت نے ممانعت کی ہے اور اس میں شریعت کے خلاف خروج اور بغاوت بدرجۂ اولیٰ شامل ہے۔

بعض علماء نے ریاست کے خلاف شہریوں کے حق مزاحمت کو درج ذیل آیات سے بھی ثابت کیا ہے:

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ ۔(ص:۲۶)

"اے داؤد علیہ السلام! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔"

وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۔(البقرہ:۲۰۵)

"جب اُسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے، اور نسل انسانی کو تباہ کرے،

حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔" [۴۶]

مزاحمت فریضہ ہے

ظلم و جبر، انحراف و تحریف اور منکر کے خلاف مزاحمت کا یہ حق واجب ریاست کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کا ضامن ہے۔ مسلم معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ اس کا یہ فرض بھی ہے کہ کلمۂ حق کہے، نیکی اور بھلائی کی حمایت کرے اور معاشرے یا مملکت میں جہاں بھی غلط اور ناروا کام ہوتے نظر آئیں اُن کو روکنے میں اپنی امکانی حد تک پوری کوشش صرف کر دے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اس سیاق میں آیات قرآنی کے علاوہ حسب ذیل احادیث سے بھی استدلال کیا ہے [۴۷]

مَن رَأى منكم منكراً فليُغيِره بيدهِ فَإن لَم يَستَطع فَبِلسانِهِ، فإن لم يَستطع فبَقلبِهِ وَذالك أضعفُ الإيمان۔ [۴۸]

"تم میں سے جو شخص برائی دیکھے اُسے چاہیے کہ اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے بُرا سمجھے (اور روکنے کی خواہش رکھے) اور ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔"

ثم إنّها تخلف من بعدهم خلوفٌ يقولون مالا يفعلون ويفعلون مالايؤمرون، فمن جاهدهم بيدهِ فهومؤمنٌ ومن جاهَدهم بِلسانِهِ فهو مُومنٌ ومن جاهَدهم بِقَلبهِ فهومومنٌ وَلَيس وراء ذالك حبّةُ خُردلٍ من الإيمان ۔ [۴۹]

"پھر اِن کے بعد نالائق لوگ ان کی جگہ آئیں گے۔ کہیں گے وہ باتیں جو کریں گے نہیں اور کریں گے وہ کام جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا ہے۔ پس جو اُن کے خلاف ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے۔ اور جو اُن کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن

ہے۔اور جو اُن کے خلاف دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے۔اور اس سے کم تر ایمان کا ذرہ برابر بھی کوئی درجہ نہیں ہے۔''

أفضلُ الجهادِ كلمةُ عَدلٍ (أوحقٍ) عند سلطان جائرٍ۔ [۵۰]

''سب سے افضل جہاد ظالم حکمراں کے سامنے انصاف کی (یا حق کی) بات کہنا ہے۔''

إنَّ النَّاسَ إذَارَ أوُ الظَّالِمَ فلَم يَاخذُ واعلیٰ يَديهِ أوَشكَ أنْ يَعُمَّهم اللّٰهُ بعقابٍ منهُ۔ [۵۱]

''لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ ان پر عذاب عام بھیج دے۔''

إنّه سَتكونُ بعدی أمراء، مَن صدَّقهم بكذبهم وَأعانَهُم علیٰ ظلمهم فليس مِنّی ولستُ مِنهُ۔ [۵۲]

''میرے بعد کچھ لوگ حکمراں ہونے والے ہیں۔ جو اُن کے جھوٹ میں اُن کی تائید کرے اور اُن کے ظلم میں اُن کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اُس سے نہیں۔''

سَيكُونُ عليكم أئِمَّةٌ يَملِكُون أرزَ اقَكُم يُحدّثونكم فيكذِبُونَكم وَيَعْمَلُونَ فَيُسيئُون العملَ لَايَرضونَ مِنكُم حتی تُحسِنُوا قبيحَهُم وَتُصدِّقُوا كذبَهُم فَأعطُوهم الحقَّ مَارضُوابه فَإذا تَجاوَزُوا فمن قُتِل علیٰ ذَالك فهوَ شهيدٌ۔ [۵۳]

''عنقریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہوں گے، جن کے ہاتھ میں تمہاری روزی ہوگی۔ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو بُرے کام کریں گے۔ وہ تم سے اُس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم اُن کی برائیوں کی تعریف اور اُن کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرو۔ پس تم ان کے سامنے حق پیش کرو جب تک وہ اسے گوارا کریں۔ پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔''

مَن أرضٰی سلطاناً بما یَسخطُ ربّهٗ خرجَ مِن دِیْنِ اللّٰہِ ۔ [۵۴]

''جس نے کسی حاکم کو راضی کرنے کے لیے وہ بات کی جو اس کے رب کا ناراض کردے وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔''

کیا درج بالا آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی یہ استدلال کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ اگر ریاست اسلام کی اساسی اقدار اور بنیادی اہداف کے خلاف خروج کرنے لگے اور اسلامی شریعت کی علی الاعلان توہین اور اس کے خلاف بغاوت پر اتر آئے تو ہر فرد معاشرہ کو ریاست کے خلاف مزاحمت کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ حق و عدل کے قیام کے لیے برسرِ پیکار ہو اور اس جہاد میں شامل ہو کر حکومت کو بنوک شمشیر اصلاح حال پر مجبور کرے اور اگر اس راہ میں جان بھی گنوانی پڑے تو مضائقہ نہیں کہ فرمان رسول اللہ ﷺ کے مطابق وہ شہداء میں شمار ہوگا۔ ان اسلامی نصوص کی روشنی میں پروفیسر سر تھامس واکر آرنلڈ کی وہ ''عالی شان عمارت'' خود بخود زمیں بوس ہو جاتی ہے جو انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اسلام کے نظریہ خلافت کے خلاف تعمیر کی تھی اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ اسلامی خلافت خود مختار، آمر مطلق اور استبدادی تھی۔

حاکمیت جمہور اور اسلام

مغرب کی سیاسی فکر پر اوپر یہ گفتگو ہو چکی ہے کہ جان لاک نے عوام کو انقلاب برپا کرنے اور حکومت کے خلاف مزاحمت کرنے کا حق دیا تھا مگر کسی دستور نے اپنی دفعات میں اس حق کو جگہ نہ دی۔ لاک نے منتخب پارلیمانی کو عوام کا نمائندہ اور ترجمان قرار دے کر عوامی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا جائز نائب تسلیم کیا تھا کیوں کہ اس کی فکر سیاسی معاشرہ کے باہمی معاہدہ کے نظریہ پر استوار ہوئی تھی۔ دوسری طرف روسو کے ارادۂ عامہ کے مقبول عام نظریہ کو بھی مغربی فکر میں کلیدی مقام دیا گیا۔ یہ وہ نظریہ تھا جس میں خطا اور سہو کا کوئی امکان نہ تھا اور جس کو قانون سازی اور تشکیل دستور کے

مراحل میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نظریہ نے مغربی پارلیمانی جمہوریت کو مزید استحکام اور دوام بخشا۔ تاہم ریاست کے خلاف حقِ مزاحمت کو ایک بنیادی حق کے طور پر کبھی تسلیم نہ کیا گیا۔

اسلام اپنے قانونی نظام میں فرد کو حقِ مزاحمت عطا کرتا ہے اور ہر فرد ریاست کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ یہ دراصل حاکم اور محکوم کے درمیان تعلقات کی فطرت اور مزاج کی عظیم الشان نظریہ کاری کا نتیجہ ہے جو سراسر عقل وفہم پر مبنی ہے۔ اسلام کا نظریہ خلافت اپنی ساخت، فطرت اور روح کے اعتبار سے ایک معاہدہ پر تشکیل پاتا ہے جو حاکم اور محکوم کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے اسی لیے تمام کلاسیکی مفکرین اسلام نے خلافت کو ایک باہمی معاہدہ کا نظریہ (فكرةُ العقد، علاقةٌ تعاقدية) قرار دیا ہے جس میں اسلامی معاشرہ کے دونوں فریق یکساں حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ امام ابو الحسن علی بن محمد حبیب الماوردیؒ (۳۶۴ھ/۹۷۴ء-۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء) کی معروف زمانہ تصنیف الأحكام السُّلطانِيّة کا مطالعہ اس سیاق میں بڑا دلچسپ ہے۔[۵۵]

الأحكامُ السُّلطانِيّة کو اسلامی نظام مملکت اور نظریۂ ریاست پر لکھی جانے والی پیش رو کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔ الماوردی فقیہ تھے اور خلیفۂ عباسی المقتدر باللہ کے دورِ حکومت میں أقضى القُضاة کے عہدے پر مامور تھے اس لیے اس کتاب کا نظریہ فلسفیانہ نہیں بلکہ فقیہانہ ہے۔ مصنف متقدمین و معاصرین کے افکار و خیالات کی جمع و ترتیب پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ مستقل اور آزادانہ رائے رکھتے ہیں اور ان کے ہاں فکری اصالت موجود ہے۔[۵۶]

الماوردی کے نزدیک خلیفہ یا امام کا تقرر شریعت اسلامیہ کا تقاضا اور ایک فرض کفایہ ہے اور خلیفہ یا امام کی بیعت پر تمام امت کا اجماع و اتفاق ضروری ہے۔ اس اجماع و اتفاق کے ذریعہ منعقد ہونے والی خلافت کے سیاسی عمل کو وہ عقدُ الإمامة کا نام دیتے ہیں[۵۷] اور معاشرہ میں باہمی معاہدہ سے جنم لینے والے اقتدار اور ریاست کی عقلی و استدلالی انداز سے نظریہ کاری کرتے ہیں۔ وہ حاکم اور محکوم کے درمیان روابط کو باہمی پیمان کی بنیاد پر استوار تعلقات کا نام دیتے ہیں جس میں معاہدہ کے مطابق ریاست بے قید اور مطلق العنان نہیں رہتی بلکہ اپنے واجبات و فرائض

کی دیانت دارانہ ادائیگی کے ساتھ مشروط ومقید ہے۔عقد امامت کے اس ماوردی نظریہ میں رعایا کے حق مزاحمت کی صورت میں ایک عقلی استناد موجود ہے جو ریاست کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کی بہترین ایجابی ضمانت ہے۔اس عقدِ امامت میں رعایا سے پہلے امام اور حکمراں کی مطلوبہ صفات سبعہ (عدالت، علم واجتہاد، سلامتیٔ حواس، جسمانی صحت وتندرستی، سیاست اور تدبیر مصالح کی فراست وبصیرت، شجاعت وخاندانی شرافت اور قریشی نسب) پر بحث ہوتی ہے [۵۸] اور امام و خلیفہ کے دس فرائض وواجبات کا بیان ہوتا ہے:

۱۔ دین کی حفاظت کرنا ہر قسم کی تحریف وتلبیس اور بدعت وفتنہ سے

۲۔ احکام شریعت کو نافذ کر کے عدل قائم کرنا

۳۔ ملک میں امن وامان کا قیام

۴۔ حدود کو قائم کرنا اور جرائم کو ختم کرنا۔

۵۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت

۶۔ دین کی تبلیغ واشاعت اور مذہب کی اقامت

۷۔ زکوٰۃ وصدقات کی وصول

۸۔ مستحق افراد کے لیے بیت المال سے وظائف کی تقسیم کا انتظام

۹۔ امانت دار اور باصلاحیت عمال اور افسران کی تقرری

۱۰۔ مملکت کے امور کی بنفس نگرانی کرنا تا کہ امت کے مفادات کا تحفظ ہو اور ملت کا بھرپور دفاع ممکن ہوسکے۔ [۵۹]

امام اور خلیفہ ان فرائض سے بحث کرنے کے بعد امام ماوردی ایک مستقل فصل قائم کرتے ہیں اور یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب امام نے امت کے مذکورہ حقوق ادا کر دیے تو امت پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ امام کی اطاعت کرے اور اس کی حمایت کرے تا آنکہ صورت حال تبدیل نہیں ہوتی۔اور اگر امام کی صورت حال بدل جائے اور وہ فرائض وواجبات ادا کرنے سے

انکار کر دے تو اسے امامت کے منصب سے ہٹانے کا حق امت کو حاصل ہو جاتا ہے۔[۶۰]

امام ماوردی کا نظریۂ عقدِ امامت اس طرح حقائق و واقعات کی پوری روشنی میں وجود میں آیا ہے اور پوری طرح اسلامی تاریخ و تہذیب سے ہم آہنگ ہے جبکہ جان لاک کی نظریہ کاری تصوراتی، خیال اور مفروضات و مزعومات پر منحصر ہے، جس کا حالات و حقائق کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے گرچہ یہ خیالی نظریہ کاری بھی بڑی وقیع اور اہم ہے۔

ماوردی کا نظریۂ عقد امامت اصول بیعت پر تشکیل پاتا ہے اور حکمراں رعایا کی جانب سے طے کردہ باہمی عہد و پیمان کے ساتھ پوری طرح منسلک ہے کہ جب بھی وہ عہد کی خلاف ورزی کرے یعنی تحریف و استبداد کا ارتکاب کرے عوام اس کے خلاف خروج کر دیں۔ اس باہمی معاہدہ کے مطابق حکمراں ہمہ وقت عوام کی گرفت و احتساب کے دائرہ میں ہیں۔

امام ماوردی کے اس نظریہ کی رُو سے یہ سیاسی معاہدہ ایک زندہ و توانا اور عقل و بصیرت پر مبنی معاہدہ ہے جس کا تعلق محض حق مزاحمت کو تسلیم کرنے سے نہیں ہے بلکہ اگر مغربی فکر کی اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ پورے جمہوری عمل سے مربوط ہے جس کا خمیر ہے حاکم اور محکوم کے درمیان اٹھتی دیواروں کو منہدم کر دینا اور جس کی روح ہے پورے معاشرہ کو متحد و منظم اور ترقی یافتہ بنانا۔

امام ماوردی کے اس نظریہ کا تجزیہ کیجیے تو پروفیسر آرنلڈ کے نظریاتِ خلافت کی حیثیت ریت کی دیوار سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ مانٹیسکو ۱۸ر جنوری ۱۶۸۹ء میں بارڈیکس فرانس میں ایک دولت مند خاندان میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وتربیت پر اس کے والدین نے خصوصی توجہ صرف کی۔ اس کا باپ ایک کامیاب وکیل تھا۔ بچپن ہی میں ۱۶۹۶ء میں اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ گیارہ سال کا ہوا تو رویٹورین اسکول میں اسے داخل کرایا گیا جہاں اس نے حسب روایت کلاسیکی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں بارڈیکس گیا جہاں اس نے قانون کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۷۰۸ء میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے اس نے پریکٹس شروع کردی۔ ۱۷۱۵ء میں اس نے شادی کرلی۔ ۱۷۱۶ء میں اس کے چچا کا انتقال ہوا تو دولت و شہرت کے ساتھ پارلیامنٹ کے نائب صدر کی کرسی بھی بھتیجے کو وراثت میں ملی۔ وہ بارہ سال تک پارلیامنٹ کی نیابت صدارت پر براجمان رہا۔ ۱۷۲۵ء میں وہ فرانسیسی اکیڈمی میں منتخب ہوا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے پارلیامنٹ کو خدا حافظ کہہ دیا اور پیرس آگیا جہاں اس نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گزرا۔ اس نے یوروپ کے مختلف شہروں کے دورے کیے۔ آسٹریا، ہنگری، اٹلی اور انگلستان گیا۔ وہاں کے سیاست دانوں اور دانشوروں سے ملاقاتیں کیں۔ ۱۷۳۴ء میں مانٹیسکو نے Reflections on the Causes of the Grandeur and Declension of the Romans لکھی مگر اُس کی اصلی شہرت معروف زمانہ تصنیف The Spirt of Laws یعنی روح قوانین کی مرہون منت ہے جو ۱۷۴۸ء میں مکمل ہوئی اور ۱۷۵۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ فاضل مصنف کی یہ تحریر اتنی مقبول ہوئی کہ ایک مختصر مدت میں اس کے بائیس ایڈیشن منظر عام پر آگئے۔ ۱۰ر فروری ۱۷۵۵ء کو فرانس کے اس مایہ ناز مفکر کا انتقال ہوگیا۔

مانٹیسکو نے روح قوانین میں تین قسم کے قوانین سے بحث کی ہے: ۱- بین الاقوامی قوانین، جو

ریاستوں کو ایک دوسرے سے متعارف کراتے اور ان کے آپسی تعلقات کی توسیع کرتے ہیں۔ ۲- سیاسی قوانین جو حاکم رعایا کے تعلقات کی استواری سے بحث کرتے ہیں، اور ۳- شہری قوانین جو افراد کے تعلقات باہمی کو مستحکم کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں تعلیم اور طرز ہائے حکومت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ مانٹیسکو کی ایک اور تصنیف ''مکاتیب پیرس'' (Persian Letters) جو ۱۷۲۱ء میں شائع ہوئی تھی، اس کی سیاسی فراست اور وسعت مطالعہ کی آئینہ دار ہے۔ ان خطوط میں اس نے فرانسیسی تہذیب اور خاص طور سے پیرس کی ثقافت کو دو ایرانی سیاحوں کے مشاہدات اور سفر ناموں کی روشنی میں خوبصورت انداز میں مرتب کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

The New Enclopaedia Britannica, 15th Edition, Volume 8 (Micropaedia), pp. 283-285.

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے عرب دنیا کے مشہور تجزیہ کار الدکتور محمد طٰہٰ بدوی کا مقالہ: 'بحث فی النِّظام السیاسي الإسلامي' مناهج المستشرقين في الدراسات العربيّة الاسلاميّة، الجزء الثاني، مكتبة التربية العربية لدول الخليج، الرّياض، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، ص ۱۰۳- ۱۳۴۔ یہ بحث زیادہ تر اسی مقالہ سے مستعار ہے جس کے لیے راقم فاضل تجزیہ کار کا مرہون ہے۔ جو لوگ تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں وہ اصل بحث کا مطالعہ کریں۔

۳۔ حقوق انسانی کا مغربی تصور سب سے پہلے رواقیت کے یونانی رومی فلسفہ میں پایا جاتا ہے جس نے فطری حقوق پر سب سے پہلے بحث کی۔ مغرب کی تحریک نشأۃ ثانیہ سے سترہویں صدی تک ایسی معاشرتی اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ یہ تصور ایک عام سماجی ضرورت اور حقیقت میں بدل گیا۔ سر تھامس اکویناس اور ہیوگو گروٹیس کی تحریروں نے اس نظریہ کو تقویت بخشی۔ میگنا کارٹا، ۱۶۲۸ء کی Petition of Rights اور انگلش بل آف رائٹس جیسی دستاویزات نے اس نظریہ کو فروغ دیا کہ انسانوں کو کچھ حقوق میسر ہیں جو ابدی اور لاینفک ہیں۔ فطری حقوق کا جدید

تصور سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے مفکرین اور دانشوروں کے لیے دلچسپی کا موضوع بنا۔ چنانچہ ڈیکارٹ، لیبنز، بینڈکٹ دی اسپنوزا اور فرانسیس بیکن کی تحریروں میں ان حقوق کو خاص طور سے موضوع بنایا گیا مگر اس سیاق میں جن سیاسی مفکرین نے کلیدی کردار نبھایا ان میں انگریز فلسفی جان لاک کا نام بہت نمایاں ہے۔ والٹیر، مانٹیسکو اور روسو کی نظریہ کاری بھی اس میدان میں بہت نمایاں ہے۔ روسو نے فرانس میں آزادی اور حقوق انسانی کی جو علمی جنگ لڑی اسی کا نتیجہ نکلا کہ ۱۷۸۹ء میں The Declaration of the Rights of Man and of the Citizen، ۱۷۹۱ء میں Bill of Rights اور ۱۷۸۷ء میں ریاست ہائے متحدہ کا دستور جیسی دستاویزات وجود میں آئیں۔ دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (مائیکروپیڈیا)، جلد ۹، ص ۱۳۷۔

۴۔ جان لاک (۲۹ر اگست ۱۶۳۲ - ۲۸ر اکتوبر ۱۷۰۴ء) انگریز ماہر تعلیم اور علم سیاست کا فلسفی، جس نے جدید سائنس کی الٰہیاتی اور متکلمانہ بنیادیں فراہم کیں، انگلینڈ اور فرانس میں تعقل اور روشن خیالی کی تحریک پیدا کی، ریاست ہائے متحدہ کی دستور سازی کا محرک اساسی بنا اور آج بھی مغرب کی زندگی اور فکر پر پوری طرح اثر انداز ہوکر، اس کی تعلیم ویسٹ منسٹر اسکول اور آکسفورڈ میں ہوئی جہاں اس نے تجرباتی علوم میں مہارت حاصل کی۔ ۱۶۶۵ء میں اس نے خارجی ممالک میں سفارت کاری کے تجربے بھی حاصل کیے۔ ۱۶۶۷ء میں لارڈ اشلے کے دربار میں طبیب اور مشیر رہا اور رابرٹ بوائیلے جیسے سائنس دانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع بھی اسے ملا۔ ۱۶۶۸ء میں وہ رائل سوسائٹی کے لیے منتخب کیا گیا اور کیمبرج کے دانش وروں اور لبرل مفکروں سے تحریک حاصل کی۔ ۱۶۷۵ء میں دمہ کی بیماری نے اسے بے چین کردیا، علاج معالجہ کے لیے اس نے مختلف اسپتالوں کے چکر لگائے مگر مرض میں افاقہ نہ ہوا۔ اس دوران اس نے فرانس جا کر ملک کے سول انجینئرنگ کے کاموں اور زراعت کے منصوبوں کا غائرانہ مطالعہ کیا۔ ۱۶۸۹ء میں اس کی مشہور زمانہ کتاب An Essay Concerning Human Understanding آئی جس نے افکار سیاسی کی دنیا میں ہلچل پیدا کردی۔ ۱۶۸۳ء سے

۱۶۸۹ء تک اس نے ہالینڈ میں رہائش اختیار کی۔ ۱۶۸۵ء میں اسے غدار اور باغی قرار دیا گیا مگر جب ولیم آف اورینج انگلینڈ میں تخت سلطنت پر بیٹھا تو جان لاک کی وطن واپسی کی راہ ہموار ہوگئی۔ ۱۶۹۱ء میں اس نے آخری ایام تک کے لیے Essex کو منتخب کیا جہاں سے بسہولت تحریر اور تنقید کا کام کرتا رہا۔ اس کی دیگر مشہور تصانیف یہ ہیں : A Letter Concerning Toleration (1689)، Two Treasises of Government (1690)

۵۔ دیکھیے دی نیوانسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (میکروپیڈیا)، پندرہواں ایڈیشن، جلد ۲۳، ص ۲۲۴

۶۔ جان جاک روسو (۲۸ر جون ۱۷۱۲-۲ر جولائی ۱۷۷۸ء) مفکر، فلسفی اور نظریہ کار، جس نے جدید مغرب کو سب سے زیادہ متاثر کیا، جس کے افکار نے تحریک عقلیت پر ضرب کاری لگائی اور رومانوی تحریک کو جنم دیا، سیاسی واخلاقی فکر کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا، اس کے اصلاحی افکار نے موسیقی اور فنون لطیفہ کے اندر انقلاب آفریں ذوق پیدا کیا۔ تعلیم کے میدان میں والدین اور سرپرستوں کو تعلیم دی کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا منہج تبدیل کریں۔ دوستی اور محبت کی دنیا کی دنیا میں اس نے شریفانہ تحمل کی جگہ اظہار جذبات کو فروغ دیا۔ عوام کے اندر مذہبی شعور کا تعارف کرایا، قدرتی جمال سے انہیں آشنا کرایا اور آزادی وحریت کو ایک مسلم فکر اور قدر کی حیثیت میں تسلیم کرنے پر مغرب کو آمادہ کیا۔ اس کی پیدائش جنیوا میں ہوئی۔ بچپن میں ماں مرگئی۔ باپ نے تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اٹھائی۔ گھڑی سازی سے ملنے والی آمدنی سے بس گزارا ہو جاتا تھا۔ ۱۶ سال کی عمر میں وطن سے فرار ہو کر رومن کیتھولک بن گیا اور سلطنت سارڈینیا میں اقامت اختیار کرلی۔ وہاں اس کی خوش قسمتی سے اسے برون ڈی وارینس خاتون کی نگرانی اور کفالت میسر آگئی جس نے اس کی تعلیم مکمل کرائی اور اس کے اندر تفکر، دانشوری اور مذہبیت کے چراغ روشن کیے۔ تیس سال کی عمر میں وہ پیرس میں داخل ہوا اور اسے روشن خیال دانشوروں کی ایک جماعت کی رفاقت مل گئی یہیں سے اس کی دانشوری کا آغاز ہوتا ہے۔ ۱۷۵۰ء میں اس نے A Discourse on the Sciences and Arts تحریر کی جس میں اس نے ہبوطِ آدم کو

انسانی زوال کے آغاز سے تعبیر کیا۔ اس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ آدمی اپنی فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے مگر معاشرہ اسے فاسد بنا دیتا ہے۔ سیاسی تصنیفات میں روسو کی ایک کتاب ۱۷۵۵ء میں طبع ہوئی سماج میں نابرابری کے اسباب وعوامل پر Discourse on the Origin of Inequality۔ ۱۷۶۲ء میں The Social Contract طبع ہوکر آئی۔ ۱۷۶۱ء میں The New Eloise نے روسو کی فکر کے متضاد پہلوؤں کو نمایاں کیا اور افراد کی عائلی زندگی اور انفرادی سعادت پر زور دیا۔ ۱۷۶۵ء میں اپنے مذہبی واخلاقی خیالات کے اظہار کے لیے The Profession of Faith of a Savoyor Vicar تحریر کی۔ اپنے باغیانہ خیالات کی وجہ سے اسے زندگی بھر سکون نصیب نہ ہوا اور وہ مختلف ملکوں اور شہروں کی خاک چھانتا رہا۔ اپنی خودنوشت The Confession اس نے مرتب کی جس میں اس نے الزامات کی صفائی دینے کی کوشش کی۔ آخر میں فرانس ہی میں اس کا انتقال ہوا

۷۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (میکروپیڈیا) پندرہواں ایڈیشن، جلد ۲۶، ص ۸۳۹-۸۴۰

۸۔ کلیات اقبال، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز دہلی، اشاعت ہشتم ۲۰۰۱ء، ص ۲۱۳

۹۔ Bertrand De Jouvenel, Le Pouvoi, p. 326 بحوالہ محمد طہٰ بدوی، حوالہ بالا، ص ۱۱۶

۱۰۔ سر تھامس آرنلڈ کی حیات اور علمی وفکری خدمات کے لیے دیکھیے:

Bakhtiyar Hasan Siddiqi, T.W. Arnold: Life and Works; Iqbal. Quarterly Journal of the Bazm-i-Iqbal, Lahore. Vol. XVI, No. 3, 1968, pp. 59-68.

اور آرنلڈ کے علی گڑھ میں قیام و استفادہ اور تدریسی وعلمی سرگرمیوں کے لیے ملاحظہ کیجیے: ڈاکٹر عبدالباری، پروفیسر سر ٹامس واکر آرنلڈ، سہ ماہی فکر ونظر علی گڑھ کا 'ناموران علی گڑھ' نمبر، پہلا کاروان، جلد ۲۲، شمارہ ۱-۳، جنوری تا ستمبر ۱۹۸۵ء، ص ۲۴۷-۲۵۸۔

۱۱۔ ۱۸۹۸ء میں سر تھامس آرنلڈ نے علی گڑھ کو خیر باد کہا۔ مولانا شبلی نعمانی نے رخصتی کے موقع پر بڑے جذباتی انداز میں خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے یہ دو بند بڑے مشہور ہے:

آرنلڈ آں کہ دریں شہر و دیار آمد و رفت
دلبرے بود کہ مارا بکنار آمد و رفت
آمدن آں گونہ بہ کالج کہ بہ گلزار نسیم
رفت زاں ساں کہ تو گوئی بہار آمد و رفت

علی گڑھ سے لاہور منتقلی کے بعد بھی آرنلڈ نے محمڈن کالج سے رشتہ اخلاص و محبت قائم رکھا۔ چنانچہ فروری ۱۹۰۴ء میں اپنی بیوی کے ہمراہ علی گڑھ آئے اور نواب محسن الملک کے ہاں رہائش اختیار کی۔ ڈاکٹر عبدالباری صاحب کا بیان ہے کہ ڈیوٹی سوسائٹی کی طرف سے چھ سو مہمانوں کے ساتھ اسٹریچی ہال میں ایک شاندار الوداعی دعوت دی گئی۔ اس موقع پر دو سپاسنامے انگریزی اور فارسی میں جدا جدا ان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ ۲۶ رفروری کو انہیں علی گڑھ والوں نے محبت وخلوص کے زبردست مظاہر کے ساتھ رخصت کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے الوداعی تاثرات ایک طویل نظم کی صورت میں پیش کیے چند اشعار درج ذیل ہیں:

دوست اور پھر دوست بھی سچا عجب نعمت ہے یاں — ہو نہیں سکتا بدل اک دوست کا سارا جہاں
آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتا کبھی اس کا خیال — دوستوں کے سامنے ہے وہ رہے جا کر جہاں
ہے یہ گو غم کا سماں لیکن مبارک ہے یہ غم — جس سے ظاہر ہوں محبت اور صداقت کے نشاں
آج ہم اس دوست سے افسوس! ہوتے ہیں جدا — دوستی پر جس کی ہم کو فخر کرنا ہے بجا
دین جس کا غیر اور بیگانہ جس کی نسل وقوم — ملک جس کا دور ہم سے اور زباں نا آشنا
خیر خواہی میں ہماری اس نے سب یک بارگی — تفرقے یہ عارضی دل سے دیے اپنے مٹا
جس قدر یاں پیش آئیں ہم کو قومی مشکلات — حاضر و غائب ہمارا ان میں ساتھ اُس نے دیا
ٹھان لی ہے اس نے گو ہم سے جدائی کی مگر — ہم تو جب جانیں ہمارے دل سے ہو جائے جدا

قصہ کوتہ ہم سے اب چھٹتا ہے پیارا آرنلڈ　　فخر سے ہم جس کو کہتے تھے ''ہمارا آرنلڈ''

(ناموران علی گڑھ، حوالہ بالا، ص۲۵۲)

۱۲۔ علامہ محمد اقبال کو آرنلڈ سے کس قدر تعلق خاطر تھا، اس کا اندازہ 'نالۂ فراق' کی اس نظم سے کیا جا سکتا ہے جو علامہ نے ۱۹۰۴ء میں آرنلڈ کی لاہور سے رخصتی کے موقع پر کہی تھی۔ ملاحظہ ہو:

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا

آئینہ ٹوٹا ہوا، عالم نما ہونے کو تھا

نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا

آہ! کیا جانے کوئی، میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت

اند کے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو

توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

(کلیات اقبال، حوالہ بالا، ص۶۴-۶۵)

اور لاہور سے آرنلڈ کی رخصتی کو ابھی ایک سال بھی مکمل نہ ہوئے تھے کہ علامہ اقبال ساری زنجیریں توڑ کر تعلیم مزید کے لیے لندن آرنلڈ کی خدمت میں جا پہنچے۔ انہوں نے آرنلڈ کی عارضی رخصتوں کے دوران انہی ایام میں لندن یونیورسٹی میں عربی زبان وادب کی تدریس بھی کی۔ دیکھیے بختیار حسن صدیقی، حوالہ بالا، ص۶۳

۱۳۔ سید نذیر نیازی، مکتوبات اقبال، اقبال اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص۹۶-۹۷

۱۴۔ Arnold, S.T.W., The Preaching of Islam- A History of the Propagation of the Muslim Faith, Delhi, 1990, pp. 5-6

۱۵۔ نفس مصدر، ص۷

۱۶۔ نفس مصدر، ص ۷۔ مصنف نے اس موقع پر درج ذیل حوالہ اپنی تائید میں دیا ہے:

G.H. Pertz: Monumenta Germaniae Historica, Vol. I, p. 349, See also .. 156, 159.

۱۷۔ نفس مصدر، ص ۸

۱۸۔ Arnold. S.T.W., The Caliphate, Oxford, The Clarendon Press, 1924, p. 42.

۱۹۔ نفس مصدر، ص ۴۲-۴۳

۲۰۔ نفس مصدر، ص ۴۵

۲۱۔ نفس مصدر، ص ۴۵-۴۶

۲۲۔ نفس مصدر، ص ۴۷-۴۸

۲۳۔ نفس مصدر، ص ۴۸

۲۴۔ نفس مصدر، ص ۴۹

۲۵۔ صحیح البخاری، کتاب الأحکام، حدیث ۴، کتاب الجهاد، حدیث ۱۰۸؛ صحیح مسلم، کتاب الإمارة، حدیث ۳۸ (تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ)

۲۶۔ صحیح البخاری، کتاب آحاد، حدیث ۱؛ صحیح مسلم، کتاب الإمارة، حدیث ۳۹؛ سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، حدیث ۸۷

۲۷۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنة، حدیث ۳۵؛ مسند احمد بن حنبل، حدیث ۶، ۳۰۲، ۳۰۵، ۳۲۱۔ یہ حدیث صحیح مسلم، کتاب الإمارة، حدیث نمبر ۶۲ میں إن الفاظ میں وارد ہے:

عن امّ سلمة رضی الله عنها أنّ رسول الله ﷺ قال: ستکون أمرآء فتعرفون وتُنكِرون فمن عرف برئ، ومن أنكر سلم، ولكن من رضی و تابَع قالُوا: أفلا نُقاتلهم؟ قال: لاما صلُّوا۔

۲۸۔ صحیح مسلم، کتاب الإمارۃ، حدیث ۶۵، ۶۶؛ سنن الدارمی، کتاب الرقاق، حدیث ۷۸، مسند احمد بن حنبل، حدیث ۶، ۲۴

۲۹۔ صحیح البخاری، کتاب الفتن، حدیث؛ صحیح مسلم، کتاب الإمارۃ، حدیث ۴۲

۳۰۔ سر تھامس آرنلڈ، خلافت (The Caliphate)، حوالہ بالا ص ۵۳

۳۱۔ علمائے مغرب اور مستشرقین کے اسلام کی سیاسی فکر کے خلاف قائم کردہ مفروضات اور غلط مزعومہ تصورات کے تجزیاتی مطالعہ کے لیے دیکھیے:

Fahad, Obaidullh, Islamic Polity and Orientatists, Institute of Islamic Studies, A.M.U. Aligarh 2002.

نیز دیکھیے راقم کی دوسری کتاب ''اسلام کی سیاسی فکر اور مفکرین (پہلی صدی سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک'' القلم پبلی کیشنز بارہمولہ کشمیر، ۲۰۱۱ء، جلد اول کا پہلا باب 'مغرب کے مغالطے'۔

۳۲۔ آرنلڈ کے الفاظ ہیں:

The political theory thus enunciated appears to imply that all earthly authority is by divine appointment. the duty of the subject is to obey. whether the ruler is just or unjust, for responsibility rests with God, and the only satisfaction that the subjects can feel is that God will punish the unjust ruler for his wicked deeds, even as he will reward the righteous monarch. (op. cit., p. 49)

۳۳۔ The New Encyclopaedia Britannica, Vol. 25, (Macropaedia), 15th edition, p. 991.

۳۴۔ نفس مصدر

۳۵۔ نفس مصدر

۳۶۔ The Caliphate, op. cit., p. 47-48

۳۷۔ نفس مصدر، ص ۵۳

۳۸۔ دی نیوانسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (مائیکرو پیڈیا)، حوالہ بالا، جلد اول، ص ۴۱

۳۹۔ نفس مصدر، ص ۴۱

۴۰۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست - فلسفہ، نظام کار اور اصول حکمرانی، مرتبہ خورشید احمد، اسلامک پبلیکشنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۹۷

۴۱۔ قانون کی حکمرانی کے اس تصور کو قرآن حکیم کی درج ذیل آیات میں بھی دیکھیے: النساء ۶۴، ۶۵، ۸۰، ۱۰۵؛ المائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷؛ الأعراف: ۳؛ یوسف: ۴۰، النور: ۵۴-۵۵؛ الأحزاب: ۳۶؛ الحشر: ۷

۴۲۔ کنز العمال، طبع دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۹۵۵ء، جلد اول، حدیث نمبر ۹۰۷، ۹۶۶

۴۳۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجهاد، حدیث ۱۰۸، کتاب الأحکام حدیث ۴؛ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الإمارة، حدیث ۳۴، ۳۸۔

۴۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

El-Awa. Muhammad S.. On the Political System of the Islamic State, American Trust Publications, Indianapolis, Indiana, 1980, pp. 83-86

۴۵۔ ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے: اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، جلد اول، اگست ۱۹۷۶ء، ص ۶۲۷

۴۶۔ دیکھیے محمد سلیم العواء، حوالہ بالا، ص ۱۱۴

۴۷۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، حوالہ بالا، ص ۴۱۴-۴۱۸

۴۸۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۲۰، ترمذی، ابواب الفتن، باب ۱۲، ابوداوٗد، کتاب الملاحم، باب ۱۷، ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب ۲۰

۴۹۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب ۲۰

۵۰۔ ابوداوٗد، کتاب الملاحم، باب ۱۷، ترمذی، کتاب الفتن ۱۲، نسائی، کتاب البیعۃ باب ۳۶، ابن ماجہ ابواب الفتن، باب ۲۰

۵۱۔ ابوداوٗد، کتاب الملاحم، باب ۱۷، ترمذی، کتاب الفتن، باب ۱۲

۵۲۔ نسائی، کتاب البیعۃ، باب ۳۴-۳۵

۵۳۔ کنز العمال، ج ٦، حدیث ۲۹۷

۵۴۔ کنز العمال، ج ٦، حدیث ۳۰۹

۵۵۔ امام الماوردی کی حیات و تصانیف کے لیے دیکھیے ظہور احمد اظہر کا مقالہ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، جلد ۱۸، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، ص ۴۱۵-۴۱۹

۵٦۔ خان، قمر الدین، الماوردی کا نظریۂ ریاست، رسالہ اقبال لاہور، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۵۸-٦۰

۵۷۔ الماوردی، ابوالحسن علی، کتاب الأحکام السلطانیۃ، تصحیح: سید محمد بدرالدین النعسانی الحلبی، طبع اول ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء، مطبعۃ السعادۃ، مصر، ص ۳۔ فاضل مصنف نے پہلا باب عقد الإمامۃ کے نام سے ہی قائم کیا ہے۔ اور بالکل ابتدائی سطروں میں صراحت کر دی ہے کہ امامت نام ہے خلافتِ نبوت کا جو دین کے تحفظ اور دنیاوی سیاست کی تنظیم کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ (حراسۃ الدین و سیاسۃ الدّنیا) اور اس قیام واستحکام شریعت کی روشنی میں واجب ہے۔

۵۸۔ نفس مصدر، ص ۴۔ فاضل مصنف نے خلیفہ یا امام کے لیے قریشی النسب ہونا ضروری قرار دیا ہے اور ثبوت میں دو حدیثیں نقل کی ہیں ۱- الأئمّۃ مِن قریش (امام قریش میں سے ہوں گے) ۲- قَدّمُوا قریشاً و لا تقدموھا (قریش کو آگے رکھو اور ان کے آگے چلنے کی کوشش نہ کرو)۔ بعد میں فقہاء نے اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ تعلیم نبوی وقتی و عارضی

حالات کے لیے تھی جبکہ قریش کی قیادت پر عرب کے تمام قبیلے متحد تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں اس حدیث کی معنویت وافادیت اور اس کی اطلاقی حیثیت تبدیل ہوگئی۔

۵۹۔ نفس مصدر، ص ۱۲-۱۳

۶۰۔ نفس مصدر، ص ۱۳-۱۴

☆☆☆

یہودیت

انسانیت کے لیے بدترین لعنت

یہودیت کا خمیر

فتنہ وفساد، تخریب و بگاڑ، بدامنی و انارکی اور انتشار اور لاقانونیت یہودیت کے عناصر ترکیبی ہیں۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تصادم اور کشمکش پیدا کر کے اپنا الو سیدھا کرنا اس کا محبوب ترین مشغلہ و فریضہ ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی چہیتی اور لاڈلی قوم صرف یہودی قوم ہے۔ انسانیت اور عزت و سیادت اس کی پیدائشی ملکیت ہے۔ اقتدار و حکمرانی اس کی وراثت ہے بقیہ دوسری قومیں ان کی خدمت و چاکری کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اس لیے ان کا سیاسی و معاشی استحصال ان کے اموال و جائداد پر ناجائز قبضہ اور انہیں اپنے مفادات کے لیے غلام بنا لینا یہودیوں کے لیے نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے۔ 'تلمود اور علمائے یہود کا نظم عمل' کو بیک نظر دیکھ کر مندرجہ بالا خیالات کی مکمل تصدیق کی جاسکتی ہے۔

پوری دنیا قدیم ترین زمانے سے ہی ان کے ناپاک عزائم اور پرخطر سازشوں سے چوکنا رہی ہے۔ انہوں نے ہر معاشرے میں فتنہ وفساد پھیلانے اور اس کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر سوسائٹی کو انہوں نے تخریب وقہریت اور جرائم کا نشانہ بنا کر اپنے جیب و دامن بھرنے میں پوری قوت صرف کردی ہے اور موجودہ صنعتی دور میں تو ان کی تخریبی کوششیں بالکل منظر عام پر آچکی ہیں۔ انسانیت کو ڈائنامیٹ کر دینے والی عبقریت اور یہودی ذہانت نے تو اب سب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ ان ہی ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے انیسویں صدی میں عالمی صہیونیت تحریک کی بنیاد ڈالی گئی جس نے یہودی سازشوں کو عالم اسلام کے سامنے اگل دیا۔ اپنے چھنے ہوئے وطن کے حصول، اور اس کی آبادکاری کے پردے میں اس نے اسرائیل کی عالمی ڈکٹیٹر شپ کی بنیاد رکھ دی۔ اور دنیا میں امن وانصاف کے لیے فریادیں کرتی رہی۔

تحریک عالمی صہیونیت کی بنیاد تھیوڈور ہرتزل (۱۸۶۰-۱۹۰۴م) نے رکھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دو اور یہودی علماء کارل مارکس (۱۸۱۷ء-۱۸۸۳ء) اور سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶-۱۹۳۹ء) کے تخریبی نظریئے منظر عام پر آئے۔ ان آخری دو نظریات نے تو پوری انسانیت کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ ان نظریات نے معاشرہ کی تخریب میں جو کارنامے انجام دیے اور علمی و تحقیقی دلائل۔ اخبارات ورسائل کے انبار اور نشر واشاعت کے دیگر وسائل کی مدد سے اپنے ذاتی اغراض و مفادات کے حصول کی خاطر انسانیت کی شیرازہ بندی کو جس بری طرح منتشر کر دیا وہ حیرت انگیز بھی ہے اور لائق تعریف بھی۔

اشتراکیت اور صہیونیت

اشتراکیت اور صہیونیت نے ایک ہی ماحول اور ایک ہی زمانے میں پرورش پائی۔ جرمنی کے مشہور شہر بون میں یہودی قومی سیاست کے جدامجد 'موسیٰ ہش' نے آنکھیں کھولیں۔ ۱۸۳۵ء میں بون یونیورسٹی میں اس نے داخلہ لیا۔ اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہیں اس نے روسو، اسپائنوز اور دوسرے مفکرین کے خیالات وافکار سے واقفیت حاصل کی۔ اسی شہر میں کارل مارکس دو یہودی انسانوں کے اختلاط سے عالم وجود میں آیا۔ یہاں تک کہ جب بون یونیورسٹی میں اس نے داخلہ لیا تو اس کے اور موسیٰ ہش کے درمیان مضبوط اور پائدار دوستی قائم ہوگئی جو ۱۸۴۳ء تک باقی رہی۔ ان دونوں نے اخبار ''رانیشیہ نوانیونج'' میں مل کر کام کیا جو کارل مارکس کے زیر ادارت نکل رہا تھا۔ دونوں دین و مذہب سے برگشتگی بلکہ اس پر جارحانہ حملہ کرنے میں مشہور ہو چکے تھے۔ کارل مارکس نے تو یہودی قوم کے مفادات کے حصول کے لیے خاص طور سے مذہب سے مخالفت مول لی تھی کیوں کہ دین و مذہب کی موجودگی میں ان کی ناپاک خواہشات پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ دونوں یہودیت کے اقتدار و حکومت سے دلچسپی رکھتے اور اس کی بازیافت کے لیے کوشاں تھے۔ دونوں کا یہ عقیدہ تھا کہ یہودی قوام بنائے گئے ہیں۔ دنیا کی قیادت تنہا ان ہی کا حصہ ہے۔ چنانچہ

جہاں موسیٰ ہش نے اپنی کتاب ''صیہونیت۔بعد کے ادوار میں'' یہودی قومیت کا نعرہ لگایا اور دنیا پر یہودیوں کی حکمرانی کا خواب دیکھا وہیں کارل مارکس نے پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ کے پردہ میں انا ولاغیری کی ہانک لگائی اور پوری انسانیت کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا ہونے اور سرمایہ داروں کے ہاتھ سے اقتدار چھین لینے کی دعوت دی۔ یہودیوں نے موقع غنیمت جانا ان کے مفادات کے حصول کا وقت آچکا تھا۔ وہ مارکسی جھنڈے تلے اکٹھا ہو گئے۔ کیوں کہ مارکسیت کی ترویج و اشاعت کے ذریعہ وہ اخلاق و کردار کے انحطاط میں بہت کچھ رول ادا کر سکتے تھے۔ زیردستوں سے ٹکرا کر، کنجشک فرد مایہ کو شاہیں سے لڑا کر اور دنیا کے سوئے ہوئے مزدوروں کو خواب غفلت سے بیدار کر کے اپنا الو سیدھا کر سکتے تھے۔ چنانچہ ڈارون کی کتاب 'اصل الانواع'[۲] جب شائع ہوئی تو یہودیوں نے اسے یہودیت کی کامیابی تصور کیا اور علماء یہود کے نظم عمل میں صاف لفظوں میں کہا گیا کہ 'ڈارون اگرچہ یہودی نہیں ہے مگر اس کی آراء کی وسیع پیمانے پر اشاعت کر کے ہم مسیحی مذہب کی تباہی کا کام لے سکتے ہیں۔''

چنانچہ مارکسیت کی وسیع پیمانے پر اشاعت کر کے یہودیوں نے اپنا مطلب خوب سیدھا کیا۔ ہر وہ سوسائٹی جہاں انہوں نے اپنے ناپاک عزائم بروئے کار لانے چاہے وہاں اشتراکی افکار کی خوب پروپیگنڈہ بازی کی۔ قطع نظر اس سے کہ اشتراکیت کا بانی ایک یہودی ہی ہے اور اس کا ہم جماعت دوست صہیونیت کا روحانی باپ سمجھا جاتا ہے۔ یہودیوں نے اس نظریہ کی خوب پذیرائی کی اسے خوب رواج بخشا یہاں تک کہ وہ ننھا پودا ایک مکمل درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ جس کے برگ و بار روس میں سامنے آئے اور پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ شجر اشتراکیت کی یہ شاخیں اوپر سے تو بہار کا منظر پیش کرتی ہیں لیکن اندر ہی اندر بڑی مسموم وبائیں پھیلا رہی ہیں چنانچہ آج بھی روس میں جبر و ظلم سیاسی و معاشی استحصال اور ڈکٹیٹر شپ مسلط ہے۔ آزادئ فکر و ضمیر اور حریت قلب و ذہن سے روس کے باشندے ناآشنا ہیں۔ آج بھی وہاں تن ڈھانپنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی صرف حکومت کے کاسہ لیسوں کو مل سکتی ہے۔ زار شاہی کی جگہ آج وہاں کمیونسٹ

پارٹی کی شہنشاہیت ہے۔ ایک سامراج دفن کر دیا گیا لیکن دوسرے بدتر خوفناک سامراج نے اس کی جگہ لے لی ہے۔

کارل مارکس نے روس میں طبقاتی کشمکش پیدا کر کے زاغ دشتی کو ہمسر شاہین چرغ بنانے کا سبز باغ دکھا کر نفرت و حقارت اور پیہم تصادم کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ زیر دستوں میں زبردستوں کے خلاف کینہ وغصہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا اور جاگیرداری و سرمایہ داری کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ اس نے طبقاتی کشمکش، سماجی و معاشی مساوات اور پرولتاریہ کی تاناشاہی کے مسائل اٹھا کر انسانیت کو قدیم وراثت سے محروم کر دیا۔ تمام اخلاقی و سماجی اقدار باطل ہو گئیں اور روحانیت اور ماورائی چیزوں پر سے ایمان اٹھ گیا۔ جس کے نتیجہ میں ایک ایسی زندگی نمودار ہوئی جس سے موت بہتر ہے۔ ایسی زندگی جس میں حریت فکر، انسانیت و شرافت، عزت و وقار، ربانی ہدایات اور اجتماعی ذمہ داریوں کا کوئی دخل نہیں۔

خوفناک خونیں طبقاتی کشمکش کے نتیجہ میں لازماً معاشرے میں دو طبقے نمودار ہوں گے۔ ایک غالب دوسرا مغلوب۔ ایک کے پاس وسائل و ذرائع، حکومت و سیادت اور قوت و طاقت ہوگی دوسرا اس سے محروم ہوگا یا بہت کم وسائل کا مالک ہوگا۔ دونوں میں تصادم اور ٹکراؤ اس وقت ختم ہوگا جب ایک طبقہ بالکل ہی پیس کر رکھ دیا جائے یا قوت و طاقت سے بالکل ہی تہی دست ہو جائے۔ اس کشمکش کی وجہ سے سوسائٹی کی دیواریں ہل جائیں گی۔ معاشرہ زوال و انحطاط کا شکار ہو جائے گا۔ ساری اخلاقی قدریں غارت ہو جائیں گی اور پرولتاریہ ڈکٹیٹرشپ کا رواج ہوگا جو مخالف فریق کو پیس کر رکھ دے گی۔ یہ صورت حال مختلف ممالک میں پیش آ چکی ہے۔ سوویت روس سب سے پہلے اس کا نشانہ بنا ہے۔ جہاں مادی فراوانی تو کسی قدر ہے لیکن روحانی پیاس بڑھتی جا رہی ہے۔ معنوی قدروں کی تشنگی کا احساس دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

یہودیوں نے روسی انقلاب میں کتنا حصہ لیا اور ۱۹۴۸ء تک وہ کس قدر سرگرمی سے اشتراکیت کی تبلیغ و اشاعت میں لگے رہے۔ پھر سوویت یونین نے اسرائیل کی حکومت کیسے تسلیم

کر لی۔ اور آج روس کو گمراہی کے کھڈ میں دھکیلنے کے بعد کس طرح بغیر کسی پابندی کے وہاں سے ہجرت کرتے جا رہے ہیں اور روسیوں سے کس بری طرح انتقام لے چکے ہیں یہ ساری تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں ہم ان کا تذکرہ کر کے اس مقالے کو طول دینا نہیں چاہتے۔ بلکہ صرف ایک واقعہ مشتے نمونہ از خروارے ہم یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں جس سے سوویت انقلاب میں یہودیوں کا عمل دخل واضح ہو جائے گا۔

صہیونی مارکسزم

۱۹۱۷ء میں جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو وہ پہلی قرارداد جس نے بڑی سیاسی اہمیت اختیار کر لی وہ ۱۹۱۷ء کا علمائے یہود کا نظم عمل ہے۔ اس سیاسی پلیٹ فارم پر کام کرنے والے بہت سے یہودی تھے۔ اس کے سات ممبروں میں سے چار ٹراٹسکی، کامنیف سوکی منکوف اور زینوویف یہودی تھے۔ اور لینن خود بھی یہودی النسل تھا۔ اس کی بیوی بھی ایک یہودیہ تھی۔ باوجود یکہ اسٹالن وہ فرد واحد ہے جس کا یہود سے کوئی خونی علاقہ نہ تھا اور اس نے یہودیوں کے خلاف فوجی مہم چلائی ہے، لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اسرائیل کی تاسیس و تشکیل میں اسٹالن کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس کے قیام کے وقت اس نے بڑھ کر اس کو تسلیم کر لیا۔

یہودیوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ حکومت کے ایوان میں بھی شریک رہیں۔ اس کی انجمنوں اور اداروں میں گھسے رہیں اور اپنے مقاصد و مفادات حاصل کرنے کے بعد اسرائیل میں شمولیت کے ساتھ مجلس الحزب کے پندرہ ممبران میں سے چھ یہودی تھے۔ پھر ۱۹۱۷ء کے سوویت انقلاب میں ۵۶۵ ممبران میں ۴۶۹ یہودی تھے۔ اور اس میں ان کی تعداد برابر بڑھتی رہی یہاں تک کہ اسرائیلی مملکت وجود میں آ گئی۔

قصہ مختصر یہ کہ پرولتاری ڈکٹیٹر شپ یہودیوں کے کندھوں پر ہی وجود میں آئی۔ اس کی تعلیمات صہیونی مارکسزم جیسی کتابوں سے پھیلتی رہیں۔ یہودیوں کو غذا ملتی رہی یہاں تک کہ فلسطین

میں انھوں نے ایک الگ حکومت بھی قائم کرلی اور بہر قیمت اس کو زندہ و پائندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

آج اسرائیل کو وجود میں آئے نصف صدی سے زیادہ بیت چکے ہیں اور ہم اپنی آنکھوں سے مارکسیت کی اسلام دشمنی اور یہود پسندی دیکھ رہے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے اسلامی ممالک اسرائیل کو مار بھگانے اور فلسطین کی بازیافت کے لیے نہ صرف کمیونسٹوں کا سہارا لیتے ہیں بلکہ ان کا نظریہ اور مسلک بھی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ حقائق سے چشم پوشی کی یہ بدترین مثال ہے۔

جنسی فساد

جنسی فساد اور معاشرتی بگاڑ میں بھی یہودیت نے کارہائے نمایاں انجام دیے اخلاق کی تباہی کردار کی خرابی اور معاشرتی اقتدار کو پامال کرنے میں یہودیوں نے فکر و فلسفہ کے راستے سے کافی کامیابی حاصل کی۔ علمائے یہود کا نظم عمل، اس قسم کی سازشوں اور منصوبوں سے بھرا پڑا ہے۔ اخلاق کی تباہی میں نظریہ جنسیات کے بانی موریس لازاروس (۱۸۲۴-۱۹۰۳ء) اور جدید تحلیل نفسی کے ماہر سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶-۱۹۳۹ء) کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔

نظریہ فرائڈ مریضوں کے اسباب، مرض اور خوابوں کی تفسیر و تعبیر سے بحث کرتا ہے وہ فطرت کی پوشیدہ نفسیات اور مخفی اسباب و محرکات کا پتہ لگاتا ہے اور آخر میں نتیجہ کے طور پر جنس اور جنسی خواہشات کو ان تمام کے پیچھے اصل محرک گردانتا ہے۔ اس اجمال سے ہٹ کر ہم تھوڑی سی تفصیل میں جانا چاہتے ہیں:

> ''فرائڈ کہتا ہے کہ شروع ہی میں جب پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس نے اپنی ماں سے جنسی خواہش پوری کرنے کی کوشش کی لیکن باپ کا اقتدار اس راستے میں حائل تھا۔ چنانچہ اس نے باپ کو راستے سے ہٹانے کی ٹھان لی اور ایک دن موقع پا کر اس نے باپ کو قتل کردیا لیکن قتل کے بعد اسے بہت افسوس ہوا اور اس نے باپ کی قبر پر جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ تاکہ اسکے باپ کی روح اس سے خوش ہو جائے گویا

کہ مذہب کی اصل ایک جنسی خواہش کی تکمیل ہے۔اس طرح اس نے مذہب بھی جنس سے ملا دیا۔''

ایک دوسری جگہ مذہب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بچہ جب بڑا ہو کر سمجھنے لگتا ہے کہ اب اس کے والدین اس کی حفاظت اور پرورش و پرداخت کرنے سے قاصر ہیں تو وہ ایک آسمانی باپ (خدا) کی خواہش پیدا کر لیتا ہے اور پھر وہ باپ (خدا) اصل باپ کی جگہ حکم و احکام کا سلسلہ جاری کرتا ہے یا عام زندگی میں امن وسکون کی حالت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان اپنی خواہشات کو دوسروں کے لیے قربان نہ کرے اور یہ ایثار و قربانی اس وقت تک نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ انسان کے سامنے اس کا کوئی معاوضہ نہ ہو۔لیکن دنیا میں چونکہ حقیقی معاوضہ کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے انسان نے خدا کا نام خیالی معاوضہ کی شکل تجویز کی۔پھر خیالی معاوضہ ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا مذہب کی موجودہ صورت کو جا پہنچا۔اپنی ایک مشہور کتاب میں لکھتا ہے۔

مذہب زندگی کی امنگ کو کچل ڈالتا ہے، کیوں کہ مذہب کا سرچشمہ بدوی اور غیر مہذب دور کے لوگوں کی من گھڑت کہانی ہے مگر اب چونکہ سائنس وجود میں آ چکی ہے اور انسانیت کی بہترین رہنما بن چکی ہے اور انسانیت کی بہترین رہنما بن چکی ہے اس لیے سائنس نے مذہب کی جگہ لے لی ہے اور اس لیے مذہب کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

''ضمیر دراصل سماج کا پولیس مین ہے جو انسان کے شعور میں پہرہ دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔صبر کی توجیہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ بچہ اپنے باپ کی شخصیت کی نقل کرتا جاتا ہے جس سے عشق مادر کی الجھن پیدا ہوتی ہے (فرائڈ کے خیال میں ہر لڑکا اپنی ماں کی طرف اور ہر لڑکی باپ کی جانب جنسی کشش رکھتی ہے۔بلوغ کے بعد یہ کشش الجھن بن جاتی ہے جو لڑکوں میں عشق مادر کی الجھن اور لڑکیوں میں عشق پدر کی الجھن کہلاتی ہے) جو بچہ کی ماں سے جنسی محبت کا نتیجہ ہوتی ہے۔باپ بچہ کی اس

خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ بنتا ہے جس سے بچہ کے شعور میں محبت ونفرت بیک وقت جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ پھر بچہ اس کشمکش سے اس طرح پیچھا چھڑاتا ہے کہ وہ طبعی طور پر اپنے باپ کی شخصیت کی زیادہ سے زیادہ نقل کرتا جاتا ہے اسی طرح لڑکی جوں جوں اپنی ماں کی شخصیت سے زیادہ قریب ہوتی جاتی ہے عشق پدر کی الجھنوں سے آزاد ہوتی جاتی ہے) اسی الجھن سے ضمیر پیدا ہوتا ہے جو اپنی ناموافق جنسی خواہشوں کو دباتا اور کچلتا ہے تاکہ ذات انا کو باپ، معاشرہ، مذہب اور روایات کے بیرونی تسلط سے اور اس کی زیادتیوں سے محفوظ رکھ سکے۔

فرائڈ کی تعبیر کے مطابق بیٹا اپنے باپ سے نفرت کرتا ہے بیٹی اپنی ماں سے نفرت کرتی ہے اور بیوی اپنے شوہر سے نفرت کرتی ہے اور شوہر کی موت کی آرزومند رہتی ہے اور جب کسی رشتہ دار کی موت پر اس کے اقرباء رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں تو وہ بھی بے میل حقیقی رنج نہیں ہوتا بلکہ اس رنگ کے اظہار سے مقصود اپنی پوشیدہ خوشی کو چھپانا ہوتا ہے جو انہیں اس رشتہ دار کی موت پر ہوتی ہے جس سے وہ پہلے ہی نفرت کرتے تھے اور اس کی موت کے خواہاں رہتے تھے۔"

فرائڈ کی نظر میں یہ منظر صرف انفرادی جذبات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا پھیلاؤ افراد اور معاشرہ کی پوری نفسیاتی زندگی پر محیط ہے چنانچہ اپنی کتاب میں ۱۷۵ پر لکھتا ہے:

"میں کئی موقعوں پر اس جانب اشارہ کر چکا ہوں کہ جذبات کی دوئی یعنی محبت ونفرت کا ایک ہی وقت میں ایک ہی شے کے لیے موجود ہونا۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر بہت سی تہذیبوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور ہمیں جذبات کی اس دورنگی کے ماخذ ومبداء کا کچھ علم نہیں ہے۔"

گویا انسانیت کے نامہ اعمال پر یہ سیاہی پھیر دی گئی ہے کہ انسان کا کوئی شعور صاف ستھرا اور گندگیوں اور آلائشوں سے پاک صاف نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی انسانیت اس قابل ہو سکتی ہے کہ

مقدر کی اس سیاہی کو دھو دے کیوں کہ نفس میں جو بھی پاکیزہ جذبہ ابھرے گا لازمی طور پر لیکن نا قابل فہم اور نا معلوم طور پر اس کے ساتھ ایک اور جذبہ بھی پیدا ہوگا جو غیر پاکیزہ ہوگا۔

غور کیجیے فرائڈ کے یہ منطقی جملے کہاں تک جا پہنچے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہیکہ باپ بیٹے ماں بیٹی بھائی بہن اور بیوی شوہر کی محبتیں اپنے جلو میں خود غرضی مفاد پرستی اور جنسی شہوات لیے ہوتی ہیں (نعوذ باللہ)۔

تاریخ سے انحراف

تاریخ فرائڈ کے اس نظریہ کے بالکل خلاف ہے۔ اسلامی تاریخ کو چھوڑیے انسانی تاریخ ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجیے ہزار ہا ایسے واقعات اور کارنامے تاریخ کے سنہرے صفات میں موجود میں جن میں خود غرضی و مفاد پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہاں آپ کو صدق و وفا، ایمان و اخلاص اور راست بازی و جان سپاری نظر آئے گی۔ دوسروں کی خدمت، ان کے لیے مر مٹنے کا جذبہ اور بیکسوں کی دل جوئی یتیموں کی کفالت مزدور، غریب، مفلوک الحال انسانوں کے محبت و رأفت کی سیکڑوں مثالیں ہیں ان واقعات میں ہم کون سی خود غرضی کی کارفرمائی قرار دیں گے؟

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کی مادی مسیحی سوسائٹی میں بھی اس طرح کی مثالیں عنقا تھیں۔ فرائڈ نے یک رخا تجزیہ کیا اور اس پر اپنے نظریہ کی عمارت تعمیر کر لی۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات فرائڈ کے افکار کے مناقض ہیں۔ اسلام ماں باپ کی توقیر و تعظیم، ان کی عزت و تکریم کو واجب کہتا ہے ان کے احکام کی بے چوں و چرا تعمیل کی نصیحت کرتا ہے خاندانی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی وصیت کرتا ہے۔ اولاد کی تعلیم و تربیت پر پورا زور صرف کر دیتا ہے اور ان کی اصلاح کے لیے والدین کو فکر مند بنائے رکھنا چاہتا ہے ایک دوسرے کو محبت و مرحمت اور ہمدردی و غمگساری کی تعلیم دیتا ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی اور ذوی الحقوق کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔ معاشرہ کے تمام باشندوں کو اتحاد و اتفاق کی تلقین کرتا ہے۔ انما المومنون اخوۃ اور

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جمیعاً وَّلا تفرَّقُوا کہہ کر سب کو ایک لڑی میں پرو دینا چاہتا ہے اور اس سب کے پیچھے اخلاق و کردار، ایمان و اخلاص اور ہمدردی و غمگساری کو ہی محرک بناتا ہے اس میں کسی خارجی جبر کی کارفرمائی تسلیم نہیں کرتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو فرائڈ کی تعلیمات کے بالکل برعکس دوسرا ہی نظریہ پیش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض نام نہاد مسلمان فرائڈ کے نظریے سے مرعوب ہی نہیں بلکہ اس کا اشتہار و اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیمات باقاعدہ داخل نصاب ہیں۔ وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو آزادانہ اختلاط اور فرائڈ کے جمالیاتی نقطہ نظر سے متعارف کرایا جاتا ہے اور تاویل یہ کہ آزادی کا تقاضا یہی ہے کہ حریت فکر کی منشا ہی یہی ہے۔ یہود انسانیت کے کبھی دوست نہیں ہو سکتے وہ آج فکر و فلسفہ کے ذریعہ پُرامن طریقہ سے پوری انسانیت کو کھوکھلا کر چکے ہیں لیکن حیرت ہے کہ پھر بھی لوگوں کی آنکھ نہیں کھلتی۔ خدائے ذوالجلال نے کتنا صحیح فرمایا ہے:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا۔ (المائدہ:۸۲)

''تم مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن مشرکین اور یہود کو پاؤ گے۔''

حواشی وتعلیقات

۱۔ تحریک صہیونیت (Zionism) یہودیوں کی اُس قوم پرستانہ جارح تحریک کا نام ہے جس کا بنیادی ہدف فلسطین کے اندر ایک یہودی ریاست کی تشکیل اور اس کی حمایت تھا۔ گرچہ صہیونیت کی تشکیل انیسویں صدی کے اواخر میں مشرقی اور وسطی یوروپ میں ہوئی مگر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کے مطابق، یہ یروشلم کی ایک قدیم ترین پہاڑی صہیون کے تاریخی وروایاتی مقام سے یہودیوں اور مذہب یہودیت کے قوم پرستانہ تعلق اور لگاؤ کے تسلسل کا اظہار کرتی ہے۔ اس تحریک کو سیاسی رنگ دیا ایک آسٹریائی صحافی تھیوڈور ہرتزل (Theodor Herzl) نے۔ اس نے ۱۸۹۷ء میں باسل، سوئزر لینڈ میں پہلی صہیونی کانگریس بلائی جس میں اس تحریک کا 'باسل پروگرام' تیار ہوا۔ اور اس میں طے کیا گیا کہ ''صہیونیت یہودیوں کے لیے فلسطین میں ایک ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد کرے گی اور اسے ملکی قانون کا تحفظ حاصل ہوگا۔'' تحریک کا مرکزی دفتر ویانا میں قائم ہوا اور اس کا ہفت روزہ Die Welt نکلنا شروع ہوا۔ صہیونی کانگریس سالانہ منعقد ہوتی رہی۔ ۱۹۰۱ء سے اس کی مدت انعقاد دو سال ہوگئی۔ خلافت عثمانیہ نے جب ہرتزل کے مطالبہ ریاست کو مسترد کر دیا تو اسے برطانیہ عظمیٰ سے حمایت مل گئی۔ ۱۹۰۳ء میں برطانیہ نے یوگنڈا میں پندرہ ہزار پانچ سو مربع کلومیٹر کا غیر آباد علاقہ صیہونی تحریک کو ریاست کے لیے دینے کی پیش کش کی مگر وہ فلسطین ہی کو ریاست بنانے پر مصر رہے۔ ۱۹۰۴ء میں ہرتزل کی موت ہوگئی مگر تحریک جڑ پکڑ چکی تھی اور اس کے دوسرے رہنما دل جمعی سے یہودی ریاست کے لیے کام کرتے رہے۔ دیکھیے The New Encyclopaedia Britannica, Micropaedia, Vol. 12, p. 922.

۲۔ کتاب کا مکمل نام ہے: On the Origin of Species by Means of

Natural Selection یہ کتاب سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر محمد قطب نے اشتراکیت کو تین بنیادوں پر ڈارون کے افکار سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ ۱- طبیعت (Nature) کو خدا کا مقام دینا اور خدا کے وجود کو نہ ماننا۔ ۲- تمام جاندار اشیاء کو ان جبری مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو خارجی مادی ماحول کے دباؤ اور جاندار کے اپنے آپ کو اس ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش سے ابھرتے ہیں۔ پھر ارتقائی مراحل میں وہ اعضاء و اعمال جو ماحول سے ہم آہنگ نہ ہوں ختم ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ زیادہ پیچیدہ اعمال سے نئے اعضا لیتے رہتے ہیں۔ حیاتیات کا یہ ارتقائی عمل اقتصادی و اجتماعی ارتقا پر بھی چسپاں کر دیا گیا۔ ۳- انسان کو مادی اور حیوانی نقطۂ نظر سے دیکھنا اور روحانی پہلوؤں اور بلند قدروں کو قطعی طور پر نظر انداز کر کے صرف جسمانی اور مادی محسوسات ہی کو تسلیم کرنا۔ دیکھیے اسلام اور جدید مادی افکار، حوالہ بالا، ص ۱۰۸-۱۰۹

حقوق انسانی کی مغربی تاریخ

اور

خطبہ حجۃ الوداع

میگنا کارٹا

مغرب میں کلیت پسندانہ روایت کو، جس کی بنیاد کلیسا اور ریاست کے اختیارات کی یکجائی پر رکھی گئی تھی۔ سب سے پہلے سترہویں صدی عیسوی میں (Puritan Parliament) پروٹسٹنٹ پارلیمان کے ذریعہ للکارا گیا۔ برطانیہ کا (Glorious Revolution) انقلابِ ذو احتشام بیرونی حملہ آور کے چنگل سے رہائی اور آزادی و خودمختاری کی ایک واضح علامت ہی نہ تھا بلکہ یہ دراصل اشرافیہ اور شہنشاہ چارلس اول کے ظالمانہ اقتدار کے خاتمہ کا اعلان بھی تھا۔ انگریزی کے مشہور شاعر جان ملٹن (John Milton) (۱۶۰۸-۱۶۷۴ء) کی نظموں نے اس انقلاب میں روح پھونکی۔ اس کی شاعری نے برطانیہ کی اس تحریک آزادی کو جاگیرداری کے خلاف ایک مخصوص رخ عطا کیا اور طبقۂ اشراف وملوک کی بدترین غلامی کے سلاسل توڑ دینے پر عوام کو آمادہ کیا۔[۱]

تاہم حقوق انسانی کی مغربی تاریخ کا آغاز بہت سے مصنفین Magna Carta سے کرتے ہیں۔ مغرب میں یہ وہ اولین دستاویز باور کرائی جاتی ہے جس میں بعض افراد کے حقوق کا اعتراف کیا گیا تھا۔ آج میگنا کارٹا کو 'شہری آزادیوں کا عظیم چارٹر' تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل شہنشاہ جان کے اختیارات کو محدود کرنے اور اس کی انتظامی وعدالتی بے اعتدالیوں پر بندش عائد کرنے کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔ یہ فریقین کے درمیان ایک قسم کا قانونی وسیاسی سمجھوتہ تھا جسے مملکت کی فلاح وبہبود کی خاطر ناگزیر سمجھا گیا تھا۔[۲]

لیکن یہ عجیب سانحہ ہے کہ یہ اہم اولین دستاویز عوام کے حقوق کے تئیں بالکل خاموش ہے۔ اس میں شاہ اور اس کے امراء کے حقوق بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ایک آدھ بار مردِ حُر

کا تذکرہ تو ملتا ہے مگر اس عوامی مردِ حُر کے حقوق کا تفصیلی بیان کہیں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر چارٹر کی دفعہ ۳۹ کی عبارت ہے:

''کوئی مرد آزاد گرفتار نہیں کیا جائے گا، نہ اسے حوالۂ زنداں کیا جائے گا، نہ اس کی آزادی سلب کی جائے گی، نہ اسے جلاوطن کیا جائے گا نہ شہر بدر کیا جائے گا، نہ کسی بہانے سے اسے تنگ کیا جائے گا اور ہم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں گے نہ اسے کسی سزا کا مستوجب سمجھیں گے جب تک کہ اس کے اُمراء کسی قانونی یا جائز انصاف کا تقاضا نہ کریں اور ملک کا آئین اس کے خلاف اقدام کرنے کی اجازت نہ دے۔''[۳]

اس چارٹر کا دوسرا المیہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے تنفیذ اور عمل درآمد کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ جان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے خود اس چارٹر کی دفعات کی دھجیاں اڑائیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغرب میں بنیادی انسانی حقوق کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی اس چارٹر کا تذکرہ ضرور ہوگا کیوں کہ پہلی بار اس نے حکومتی اختیارات پر بندش لگانے کا نظریہ پیش کیا۔[۴]

برطانوی مسودۂ حقوق

بنیادی حقوق کی تاریخ میں دوسرا اہم کارنامہ برطانوی مسودۂ حقوق (British Bill of Rights) کی تیاری ہے۔ برطانوی بادشاہوں اور پارلیمان کے درمیان ایک طویل سیاسی جدوجہد کے نتیجہ میں مسودۂ حقوق کی منظوری دراصل بادشاہت کے آمرانہ اختیارات پر پارلیمان کی فتح اور برتری کا اعلان تھی۔ ۲۳ر دسمبر ۱۶۸۸ء کو شہنشاہ جیمس دوم کا برطانیہ سے فرار اور فرانس میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش اور اس کے بعد ۲۲ر جون ۱۶۸۹ء کو لندن میں پارلیمنٹ کے ذریعہ مسودۂ حقوق کی منظوری کی تاریخ عوامی حقوق کے اعتراف وتحفظ کی تاریخ ہے۔ اس مسودہ نے

شہنشاہ جیمس دوم کی کلیت پسندانہ حکومت کی مذمت کی۔ مسودہ کے پہلے حصہ میں بادشاہ کے استحصال اور حکومتی اختیارات کے غلط استعمال پر سخت تنقید کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں پارلیمان کو مقتدر اعلیٰ تصور کیا گیا ہے اور اس کی طویل سیاسی کشمکش کی تعریف کی گئی ہے اور اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ پارلیمان کی منظوری کے بغیر قوانین کی تنسیخ یا اُن کی تنفیذ غیر قانونی ہے۔

بادشاہ جیمس دوم کے خلاف پارلیمان کی یہ فتح انگلستان کی سیاسی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ یہ جمہوری عوامی طرز حکومت کی اولین بنیاد ہے اس کے بعد ہی پارلیمانی برتری کا تصور اجاگر ہوا اور برطانوی پارلیمنٹ حقوق انسانی کے محافظ قرار دی گئی۔

برطانوی پارلیمان میں مساوی نمائندگی کے لیے سالوں تک جدوجہد کرنے کے بعد امریکی عوام نے بالآخر برطانوی استعمار کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور ۲ر جولائی ۱۷۷۶ء کو امریکیوں کی آزادی کا پروانہ تیار ہو گیا اور دو دنوں کے بعد ۴ر جولائی ۱۷۷۶ء کو یہ اعلان کر دیا گیا کہ:

(الف) تمام انسان یکساں اور مساوی پیدا کیے گئے ہیں

(ب) انہیں خدا کی طرف سے متعدد حقوق پیدائشی طور پر ودیعت ہوئے ہیں، حیات، حریت اور خوشی ومسرت کے حقوق ان سے سلب نہیں کیے جا سکتے۔

(ج) حکومت انہی کے تحفظ کے لیے قائم ہوتی ہے اور وہ اپنے اختیارات عوام کی مرضی ومنظوری سے ہی حاصل کرتی ہے اور

(د) جب حکومت اَن حقوق کی پامالی پر اتر آتی ہے تو عوام کو چاہیے کہ اس کا خاتمہ کر دیں یا تبدیل کر دیں۔ [۱۲]

ان بنیادی نکات کے بعد اس اعلانیہ نے شہنشاہ انگلینڈ جارج سوم کے ظالمانہ نظام حکومت اور استحصال وجبر کی پالیسیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اعلانیہ کہتا ہے:

''موجودہ شاہ برطانیہ کی تاریخ مسلسل جراحتوں اور ناجائز قبضوں اور مداخلتوں کی تاریخ ہے۔ ان سارے اقدامات کا مقصد تمام ریاستوں پر مطلق العنان ظلم و

استحصال کے قیام کے سوا کچھ نہیں۔"[۸]

اعلانیہ کا اختتام مندرجہ ذیل عبارت پر ہوتا ہے:

"ان تمام مظالم کے ہر مرحلہ میں ہم نے انتہائی عاجزی وانکساری سے اشک شوئی کی درخواست پیش کی۔ ہماری مسلسل رحم آمیز التجاؤں کا جواب بتکرار جراحتوں سے دیا گیا۔ ایک شہزادہ جس کا ہر عمل ظلم وآمریت کی طرف پیش رفت کرتا ہو، مردانِ حُر پر حکومت کرنے کا اہل نہیں ہے۔"[۹]

اعلانیہ کی عبارتوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ امریکی عوام کے ساتھ کس درجہ ناروا اور ظالمانہ سلوک کیا گیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ ایسے مطلق العنان اور آمر بے نکیل کے خلاف اپنے بنیادی حقوق کی حفاظت کے لیے وہ کمربستہ ہوئے۔ آزادی وحریت کے اس اعلانیہ نے برطانوی شہنشاہیت کی مذمت بھی کی اور عوامی حقوق کی حمایت بھی۔

دستور ریاستہائے متحدہ

ریاست ہائے متحدہ کا دستور ۷ استمبر ۱۷۸۷ء کو تیار اور نافذ ہوا۔ اصل دستور میں مسودۂ حقوق (Bill of Rights) شامل نہ تھا۔ یہ اضافہ بعد میں ہوا اور اولین ترمیمی بل کے نام سے معروف ہوا۔ تاہم اصل دستور میں حقوق انسانی سے متعلق کچھ دوسرے نکات شامل تھے۔ جن سے تحدید اختیارات (Limitation of Powers) کے کچھ نشانات ملتے ہیں۔ دستور میں انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے اختیارات الگ کر دیے گئے تاہم یہ تقسیم کچھ اس طرح عمل میں آئی کہ یہ پتا چلانا دشوار ہوگیا کہ ان تینوں شعبوں میں اعلیٰ اور برتر کون سا ہے صدر کو انتظامیہ کا سربراہ متعین کیا گیا مگر تمام اہم معاملات میں ایوان بالا (Senate) سے مشورہ لینا اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔ حکومت کے تینوں شعبوں میں اختیارات کی تقسیم اور تحدید کا مقصد دراصل حقوق انسانی کا تحفظ اور حکومت کو طاقت کے غلط استعمال سے روکنا تھا۔

تحدید اختیارات کی تنفیذ کے باوجود جب قانون یا دستور کا مسودہ تیار ہوا تو تمام ریاستوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیا کیوں کہ اس تحدید و تقسیم پر عوام مطمئن نہ تھے اور اسے اپنی آزادی و حریت کے تحفظ کے لیے کافی نہ سمجھتے تھے۔ دراصل عوام جب حقوق کی بات کرتے ہیں تو چافی کے بقول 'آزادی و حریت کی برکتوں' پر ان کی نگاہ ہوتی ہے۔[۱۰] اور اس طرح کی نعمتیں دستور میں موجود نہ تھیں اس لیے پہلے ترمیمی بل کے نام سے مسودۂ حقوق کا اس میں اضافہ کیا گیا۔

مسودہ حقوق میں دس دفعات شامل ہیں۔ یہ مسودہ مذہبی آزادی، اظہار رائے اور تقریر کی آزادی اور پریس اور اجتماع کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ بغیر قانون کے تقاضوں کو پورا کیے کسی شہری کو حیات، حریت اور جائیداد کے حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ بعد میں کالے امریکیوں کے مطالبہ پر دفعہ ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ کا اضافہ کیا گیا اور غلامی ممنوع قرار پائی اور بلیک امریکیوں کو بھی حق رائے دہندگی عطا کیا گیا۔ نیز عوامی مقامات پر امتیاز اور تفوق کا خاتمہ ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں انیسویں ترمیم کے ذریعہ حق رائے دہندگی کو عام کیا گیا اور خواتین کو بھی ووٹ کے حق سے نوازا گیا۔[۱۱]

فرانس کی جدوجہد

حقوق انسانی کی مغربی تاریخ میں فرانس کی جدوجہد اور اس کے مفکرین کی نظریہ سازی کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ۴-۵/اگست ۱۷۸۹ء کی درمیانی شب کو فرانس کی نیشنل اسمبلی نے جاگیرداری کے خاتمہ کا اعلان کیا۔[۱۲] اس نے شہریوں کے فطری حقوق کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے ایک کمیٹی مقرر کیا تا کہ بنیادی حقوق کا مسودہ تیار کرسکے۔ یہ مسودہ ۲۶/اگست ۱۷۸۹ء کو آخری اور قطعی شکل پا کر نئے دستور کے تمہیدی حصہ (Preamble) میں شامل ہوا۔[۱۳]

اس فرانسیسی مسودہ میں بنیادی حقوق سے متعلق سترہ دفعات ہیں۔ پہلی اور دوسری دفعات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہر فرد آزاد اور مساوی الحقوق پیدا ہوا ہے۔ سماجی امتیازات

معروف اور بھلائی ہی کی بنیاد پر قائم ہو سکتے ہیں۔ آزادی، جائیداد، تحفظ اور ظلم کا دفاع فطری حقوق میں شامل ہیں جو ہر فرد کو ملنے چاہئیں۔ دفعہ ۳ کے مطابق اقتدار اعلیٰ پوری قوم کا ورثہ ہے اور قوم کی براہ راست یا اس کے نمائندوں کے ذریعہ معلوم ہونے والی مرضی اور رائے سے ہی حاکمیت کا استعمال جائز ہے۔ اس مسودہ نے مذہبی عبادت اور تحریر و تقریر کی آزادی کی ضمانت دی۔ جبری مزدوری کو ممنوع قرار دیا۔ تمام شہریوں کو قانون کی نگاہ میں برابر قرار دیا اور یہ کہ قانون کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر کسی شخص کو حراست میں لیا جا سکتا ہے، نہ جیل میں ڈالا جا سکتا ہے نہ اسے ہراساں کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ جائداد ہر شخص کا فطری حق ہے اور کسی شخص کو اس وقت تک اس کے جائیداد سے محروم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ عوامی ضروریات جائز طور پر اس کا تقاضا نہ کریں۔[۱۴] بنیادی حقوق کا یہ فرانسیسی اعلانیہ اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی تاریخی اہمیت اور اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے مغربی اقوام کو ہی نہیں بہت سی ایشیائی اور افریقی مملکتوں کو بھی مہمیز کیا۔ متعدد ممالک نے فرانس کی تقلید کی اور اپنے دساتیر میں اس اعلانیہ کو مناسب جگہ دی۔

اقوام متحدہ کا چارٹر

حقوق انسانی کی مغربی تاریخ میں اقوام متحدہ کا چارٹر زریں حروف سے لکھا جاتا ہے کہ پہلی بار اتنے جامع انداز میں مغربی اقوام نے حقوق انسانی کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ اقوام متحدہ نے بنیادی انسانی حقوق کی سفارشات و تجاویز کو طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی میں امریکہ کی نمائندگی ایلی نارروز ویلٹ (Eleanor Roosevelt) کر رہی تھیں۔ انہوں نے تمام انسانی حقوق کا تفصیلی مطالعہ کر کے جون ۱۹۴۸ء میں ایک ڈرافٹ تیار کیا جو کمیٹی کے تمام اراکین نے سوائے سویٹ بلاک کے من و عن تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ۱۰/ دسمبر ۱۹۴۸ء کو یہ ڈرافٹ منظور ہو گیا۔

اقوام متحدہ کا یہ اعلانیہ ایک تمہید اور تیس دفعات پر مشتمل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکی دستور کے مسودہ حقوق کا یہ ایک جامع اور تفصیلی مطالعہ ہے۔ پریس، تحریر و تقریر اور تنظیم و اجتماع کی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے یہ اعلانیہ حیات، حریت اور جائیداد کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ اس کے مطابق تمام شہری ذات پات، مذہب و دین اور رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر قانون کی نگاہ میں مساوی ہیں۔ اقوام متحدہ کا یہ چارٹر یکساں اور مساوی حقوق کا علمبردار ہے تا کہ پوری دنیا کے عوام آزادی سے جی سکیں اور انہیں ظلم و استحصال کا کوئی خوف نہ رہے۔ یہ تو کاغذی دستاویزات کی تفصیلات ہیں جہاں تک ان کی تنفیذ اور عمل درآمد کا تعلق ہے تو اقوام متحدہ کا یہ چارٹر 'مقدس خواہشات' (Pious Wishes) سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ ان کے پیچھے کوئی سند اور کوئی قوت نافذہ نہیں ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس بین الاقوامی منشور کے عین سائے میں انسانیت کے بالکل ابتدائی حقوق کا قتل عام دنیا میں ہو رہا ہے اور خود مہذب ترین اور سرکردہ ممالک کے اپنے ہاں ہو رہا ہے جو اسے منظور کرنے والے تھے۔[۱۵]

خطبہ حجۃ الوداع

اس تفصیلی تجزیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا میں بنیادی حقوق کا تصور دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا اور اگر آج ان حقوق کا خوشنما تذکرہ ہو رہا ہے تو اپنے پیچھے کسی قوت نافذہ اور ہیئت حاکمہ کا وجود نہیں رکھتا اس کے مقابلہ میں قرآن نے حقوق انسانی کا جو منشور دیا اور جس کا خلاصہ رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر نشر فرمایا وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور ملت اسلامیہ کے لیے اعتقاد، اخلاق اور مذہب کی حیثیت سے واجب الاتباع بھی۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان حقوق کو عملاً نافذ کرنے کے لیے سیرت رسول ﷺ کی بے مثال نظیریں موجود ہیں۔ اللہ کے رسول فداہ ابی وامی نے میدان عرفہ میں ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

''خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں، خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تنہا اسی کی ذات نے باطل کی ساری مجتمع قوتوں کو زیر کیا۔

لوگو، میری بات سنو، میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کبھی ہم اس طرح کسی مجلس میں یکجا ہو سکیں گے!

لوگو! اللہ کا ارشاد ہے کہ ''انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے تا کہ تم باہم پہچانے جا سکو۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو خدا سے ڈرنے والا ہے۔'' اب نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔

انسان سارے ہی آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے۔ اب فضیلت و برتری کے سارے دعوے خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں بس بیت اللہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات علی حالہ باقی رہیں گی۔

پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ خدا کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمہاری گردنوں پر دنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔

قریش کے لوگو! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے فخر و مباہات کی کوئی گنجائش نہیں۔ لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں ہمیشہ کے لیے۔ ان چیزوں کی حرمت ایسی ہی ہے جیسی تمہارے اِس دن کی اور اِس ماہ مبارک کی خاص کر اس شہر میں ہے۔ تم سب خدا

کے آگے جاؤ گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

دیکھو! کہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں ہی کشت وخون کرنے لگو!

اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ وہ صاحبِ امانت تک اسے پہنچا دے۔

لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو، ہاں غلاموں کا خیال رکھو، انہیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ ایسا ہی پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو۔

دور جاہلیت کا سب کچھ میں نے پیروں سے روند دیا۔ زمانہ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بیٹے کا خون جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا، میں معاف کرتا ہوں۔ دور جاہلیت کا سود اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پہلا سود جس کو میں چھوڑتا ہوں عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کا سود ہے، اب یہ ختم ہو گیا۔

لوگو! خدا نے ہر حق دار کو اس کا حق خود دے دیا ہے۔ اب کوئی کسی وارث کے حق کے لیے وصیت نہ کرے۔

بچہ اسی کی طرف منسوب کیا جائے گا، جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا۔ جس پر حرام کاری ثابت ہو اس کی سزا سنگساری ہے۔ حساب وکتاب خدا کے ہاں ہو گا۔

جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام اپنے آقا کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا آقا ظاہر کرے گا، اس پر خدا کی لعنت ہے۔

قرض قابل ادا ہے۔ عاریۃً لی ہوئی چیز واپس کی جانی چاہیے۔ تحفہ کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے وہ تاوان ادا کرے۔ کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ

اپنے بھائی سے کچھ لے سوائے اس کے جس پر اس کا بھائی راضی ہو اور خوشی خوشی دے۔ اپنے نفس پر اور دوسروں پر زیادتی نہ کرے۔

عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال بغیر اس کی اجازت کے کسی کو دے۔

دیکھو! تمہارے اوپر تمہاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح ان پر تمہارے حقوق واجب ہیں۔ عورتوں پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی خیانت نہ کریں نہ کوئی کام کھلی بے حیائی کا کریں اور اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انہیں معمولی جسمانی سزا دو اور وہ باز آ جائیں تو انہیں اچھی طرح کھلاؤ پہناؤ۔

عورتوں سے بہتر سلوک کرو کیوں کہ وہ تو تمہارے پابند ہیں اور خود اپنے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ان کے بارے میں خدا کا پاس و لحاظ رکھو کہ تم نے انہیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اسی کے نام پر وہ تمہارے لیے حلال ہوئیں۔ لوگو میری بات سمجھ لو میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا۔

میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو گے اگر اس پر قائم رہے۔ اور وہ خدا کی کتاب ہے اور ہاں دیکھو دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ انہی باتوں کے سبب ہلاک کر دیے گئے۔

شیطان کو اب اس بات کی کوئی توقع نہیں رہ گئی ہے کہ اب اُس کی اس شہر میں عبادت کی جائے لیکن اس کا امکان ہے کہ ایسے معاملات میں جنہیں تم کم اہمیت دیتے ہو اس کی بات مان لی جائے اور وہ اسی پر راضی ہے، اس لیے تم اُس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنا۔

لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرو۔ مہینے بھر کے روزے رکھو۔ اپنے مالوں کی زکوٰۃ خوش دلی سے دیتے رہو، اپنے خدا کے گھر کا حج کرو اور اپنے

اہل امر کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

سن لو، مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمہ دار ہوگا۔ نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔

دیکھو، جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہیے کہ یہ احکام اور باتیں ان لوگوں کو بتا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر موجود تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو۔

اور لوگو! تم سے میرے بارے میں خدا کے ہاں سوال کیا جائے گا، بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟

لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپ ﷺ نے امانت پہنچا دی اور آپ نے حق رسالت ادا فرما دیا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔

یہ سن کر رسول ﷺ نے اپنی انگشتِ شہادت آسمان کی جانب اٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا![۱۶]

حقوق انسانی کی ضمانت

سن ۱۰ھ کا یہ خطبہ حجۃ الوداع اس بات کا اعلان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انسانی حقوق کی کامل ضمانت اس وقت دے دی تھی جبکہ دنیا اس تصور سے یکسر نا آشنا تھی اور یہ دراصل الہامی ہدایت کا اعجاز ہے کہ وہ زندگی کی ان بنیادوں کو واضح کرتی ہے جن تک انسانی ذہن کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ حجۃ الوداع کا یہ خطبہ درج ذیل بنیادی حقوق کا اعلان کرتا ہے:

۱۔ حرمت جان یا جینے کا حق[۱۷]

۲۔ معذوروں اور کمزوروں کا تحفظ

۳۔ تحفظ ناموس خواتین

۴۔ معاشی تحفظ [۱۸]

۵۔ عدل وانصاف [۱۹]

۶۔ نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون [۲۰]

۷۔ مساوات کا حق [۲۱]

۸۔ معصیت سے اجتناب کا حق

۹۔ ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق [۲۲]

۱۰۔ سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق [۲۳]

۱۱۔ آزادی کا تحفظ

۱۲۔ تحفظ ملکیت [۲۴]

۱۳۔ عزت کا تحفظ [۲۵]

۱۴۔ نجی زندگی کا تحفظ [۲۶]

۱۵۔ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق [۲۷]

۱۶۔ آزادیٔ اظہار رائے [۲۸]

۱۷۔ ضمیر واعتقاد کی آزادی کا حق [۲۹]

۱۸۔ مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق [۳۰]

۱۹۔ آزادی اجتماع کا حق [۳۱]

۲۰۔ عمل غیر کی ذمہ داری سے برّیت [۳۲]

۲۱۔ شبہات پر کارروائی نہیں کی جائے گی [۳۳]

خطبہ حجۃ الوداع کے ان اکیس بنیادی حقوق کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ سیرت نبوی کی تعلیمات میں حقوق انسانی کا تصور بالکل واضح اور مکمل ہے اور اس کے مقابلہ میں Declaration of Human Rights کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں اتنی

صراحت و وضاحت نہیں ہے جو یہاں جلوہ گر ہے پھر دوسری بات یہ ہے کہ کہ اقوام متحدہ نے بس ایک بلند معیار پیش کر دیا ہے۔ اس پر عمل درآمد کی کوئی قوم پابند نہیں ہے نہ یہ کوئی ایسا مؤثر معاہدہ ہے جو ان حقوق کو ساری دنیا سے منوا سکے لیکن حجۃ الوداع کے یہ نکات واجب الاتباع ہیں ہر مسلمان فرد اور ریاست اس ہدایت کی پوری پابند ہے۔ جو مملکت اسلامی ریاست بننا چاہے گی اسے بغیر کسی معاہدہ یا سمجھوتہ کے یہ حقوق لازماً دینے ہوں گے اور اس میں اپنوں اور پرایوں، دوستوں اور دشمنوں کی کوئی تفریق نہ ہوگی۔ اسی لیے تو قرآن نے واضح لفظوں میں اعلان کر دیا تھا کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔ [۳۴]

”آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔“

اور اقبالؒ کو یہ کہنے کی ہمت ہوئی کہ:

بمصطفٰی برساں خویش کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

حواشی وتعلیقات

۱۔ Hans Kohn, Nationalism: Its Meaning and History. Van Notrand Reinhold Co, NewYork, 1971, p. 16.

۲۔ W.Y. Elliott and N.A. Mcdonald. Western Political Heritage, Prentice Hall Inc New York, 1949, P. 347.

میگنا کارٹا چارٹر کی دفعہ ۶۱ شہنشاہ اور فریق ثانی کے تعلقات پر اس طرح روشنی ڈالتی ہے:

"Since, moreover, for the sake of God, and for the improvement of our kingdom, and for the better quieting of the hostility sprung up lately between us and our barons, we have made all these consessions; wishing them to enjoy these in a complete and firm stability forever, we take and concede to them the security described below.....

۳۔ Z. Chafee, Documents on Fundamental Human Rights: The Anglo-American Tradition, Atheneum, New York, 1963. Vol. 1. P. 251.

۴۔ اسی لیے ایک امریکی صدر ووڈ رو ولسن نے لکھا ہے کہ:

The history of liberty is the history of the limitations on government power, not the increase of it. Then we resist.... concentrations of power, we are resisting the power of

death, becuase concentration of power is what always procedes the destruction of human liberties.

A.K. Brohi, Fundamental Law of Pakistan, Din Mohammad Press, Karachi, 1958, p. 300

۵۔ چافی، ڈاکومینٹس آن فنڈامنٹل ہیومن رائٹس، حوالۂ بالا، ص ۲۶۷-۲۶۸

۶۔ نفس مصدر، ص ۲۷۰

۷۔ ایلیٹ اور میکڈانلڈ، ویسٹرن پولیٹکل ہریٹج، حوالہ بالا، ص ۶۰۰

۸۔ نفس مصدر

۹۔ نفس مصدر، ص ۶۰۲

۱۰۔ چافی، ڈاکومینٹس آن فنڈامنٹل رائٹس، حوالۂ بالا، ص ۱-۳

۱۱۔ دستور ریاست ہائے متحدہ امریکہ، ترمیم ۱۳، ۱۴، ۱۵ اور ۱۹

۱۲۔ James H. Robinson, ed. Translation and Reprints from the Original Sources of European History, University of Pennsylvania Press, Philadelphia, 1900, p. 2

۱۳۔ Crane Brinton, Declaration of the Rights of Man and the Citizen, Encyclopaedia of the Social Sciences, Macmillon Co. New York, 1932. Vol. 5, p. 99

۱۴۔ جیمس ایچ رابنسن، حوالۂ بالا، ص ۶-۸

۱۵۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۵۵۴

۱۶۔ ابومحمد عبدالملک بن ہشام، سیرۃ النبی ﷺ، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، الجزء الرابع، دارالفکر، ص ۲۷۵-۲۷۷

۱۷۔ قرآن کریم، سورہ مائدہ: ۳۲

۱۸۔ قرآن کریم، سورہ ذاریات: ۱۹، دھر: ۸

۱۹۔ قرآن کریم، سورہ مائدہ: ۸

۲۰۔ قرآن کریم، سورہ مائدہ: ۲

۲۱۔ قرآن کریم، سورہ حجرات: ۱۳

۲۲۔ قرآن کریم، شعراء: ۱۵۱، کہف: ۲۸، نحل: ۳۶، ہود: ۵۹

۲۳۔ قرآن کریم، سورہ نور: ۵۵، شوریٰ: ۳۸

۲۴۔ قرآن کریم، سورہ البقرہ: ۱۸۸

۲۵۔ قرآن کریم، حجرات: ۱۱-۱۲

۲۶۔ قرآن کریم، سورہ نور: ۲۷، سورہ حجرات: ۱۲

۲۷۔ قرآن کریم، سورہ نساء: ۱۴۸

۲۸۔ قرآن کریم، آل عمران: ۱۱۰

۲۹۔ قرآن کریم، سورہ البقرہ: ۲۵۶

۳۰۔ قرآن کریم، سورہ انعام: ۱۰۸

۳۱۔ قرآن کریم، سورہ آل عمران: ۱۰۴

۳۲۔ قرآن کریم، انعام: ۱۶۴

۳۳۔ قرآن کریم، سورہ حجرات: ۶-۱۲۔ ان اکیس بنیادی حقوق پر مولانا مودودی نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ تفصیل کے لیے مولانا کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اسلامی ریاست، حوالۂ بالا، ص ۵۵۴-۵۷۱

۳۴۔ قرآن کریم، سورۂ مائدہ: ۳

☆☆☆

روسی سامراج اور مملکت اسرائیل

روس سے یہودیوں کا انتقام

مارکسی نظریات کا مطالعہ کرنے والا ہر طالب علم اچھی طرح سمجھتا ہے کہ ان کی عمارت عین "برطانوی معاشرہ" کے کھنڈر پر کھڑی کی گئی ہے، یہودی پہلے جرمنی یا برطانیہ میں بالشویکی انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے لیکن ۱۸۹۷ء کے بعد ان کی رائے میں تبدیلی آ گئی اور انہوں نے اپنی تمناؤں کا مرکز روس کو بنالیا، کیوں کہ وزارت کی کرسیوں پر قبضہ جما کر اور بڑے بڑے منصب حاصل کر کے وہ برطانیہ پر قابض ہو چکے تھے اور اب اپنی جملہ کوششوں کو کسی دوسرے شکار پر صرف کرنا تھا، اس کے لیے روس سے بہتر ملک اور کوئی نہ تھا وہ یہاں اپنے قدم جما کر روسی قوم سے بدترین انتقام لے سکتے تھے، روسی یہودیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، پھر ان کی تعداد روس میں تقریباً ستر لاکھ تھی، اس لحاظ سے یہودیوں کا سب سے بڑا مرکز روس ہی تھا، پھر ۱۸۸۲ء میں ڈکٹیٹر پطرس ثانی کے یہودیوں کو بری طرح قتل کر دینے کے بعد بھی انہیں بری طرح ذبح کیا جا رہا تھا، ان عوامل کے ساتھ ہی ایک بڑا عامل یہ بھی تھا کہ روس کی دولت چند جاگیرداروں کے ہاتھ میں گردش کر رہی تھی، عوام اس کی افادیت سے محروم تھے، اب وقت آ گیا تھا کہ آقا و بندہ کی طبقاتی کشمکش چھیڑ کر روسی قوم سے بھرپور انتقام لیا جائے، چنانچہ یہی ہوا۔

لینن نے سوئزرلینڈ سے روسی اخبار 'شعلہ' نکالنا شروع کیا اور ٹراٹسکی کے ساتھ مل کر تخریب کاری میں لگ گیا، وہیں اس نے کارل راڈیک کی موجودگی میں مشہور صیہونی لیڈر حاییم وائس مین (Chaim Wiezmann) اور اس کے صیہونی رفیق اور نامور مصنف جاک یسوئے، آسٹریا کے یہودی پروفیسر مولروڈسیم اور پولینڈ کے یہودی پروفیسر ڈیوڈ ہارن سے ملاقات کی ۱۸۹۷ء میں یہودیوں کی کانفرنس میں شرکت کی اور مشہور صیہونی لیڈر ہرتزل سے ملا، ۱۹۱۶ء میں

لینن اور وائس مین کے درمیان ایک یہودی صنعت کار دانیال شوین کے مکان پر ملاقاتیں ہوتی رہیں جن کا مقصد روس میں زار کی سلطنت کا خاتمہ اور اس کے کھنڈر پر مارکسی ریاست کا قیام تھا، ان ملاقاتوں کی کارروائی جاک لیوے نے قلمبند کی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق لینن نے گفت وشنید کے دوران وائس مین سے کہا:

''روسی انقلاب کی کامیابی کی بدولت ہی یہود یوروپ کے سلاطین اور حکام کے کابوسوں سے نجات پا سکتے ہیں اور انہیں حکومت کے اندر اعلیٰ مراتب حاصل ہو سکتے ہیں اور ان کا وقار اور تشخص بحال ہو سکتا ہے۔ یہ انقلاب پراگندہ حال یہودی قوم کا وہ مقصد پورا کردے گا جسے پورا کرنے سے ۱۷۸۹ء کا فرانسیسی انقلاب بھی عاجز رہا ہے، جوں ہی روس کی سرزمین سے زار کی بساط الٹی اور کلیسا کی فرماں روائی ختم ہوئی وہاں ایک خالصۃً مارکسی ریاست قائم کر دی جائے گی جس کی تعمیر ان بنیادوں پر استوار ہوگی جن کا مقصد مشرق اور مغرب میں طویل المیعاد منصوبوں کی تکمیل ہے۔''

وائس مین نے رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''یہود کے لیے مشرق کا دروازہ اسی وقت کھل سکتا ہے کہ عثمانی سلطنت کو کلیۃً مسمار کر دیا جائے عثمانی سلطنت اگر کلیۃً محو ہوگئی تو اس کے ساتھ ہی وہ تمام دیواریں اور رکاوٹیں زائل ہو جائیں گی جو ارض موعود کی طرف پیش قدمی کرنے میں حائل ہو رہی ہیں عثمانی سلطنت کا چراغ اب گل ہونا چاہتا ہے، اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ جوں ہی روس کا اشتراکی انقلاب اپنی منزل کو پہنچ جائے فلسطین کے اندر اشتراکی بنیادوں پر دولتِ یہودیہ کی داغ بیل ڈال دی جائے۔''

لینن اور اس کے مجوزہ انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سانٹینے اپنی کتاب ''صہیونیت اور بالشویک انقلاب'' میں جو ۱۹۲۶ء میں میلانو سے شائع ہوئی تھی، لکھتا ہے:

"صہیونیوں کی اشتراکی تحریک صنعتی اور لاطینی یوروپ کے اندر اس طرز کے انقلابات بھڑکانے میں ناکام ہوگئی جس طرز کا انقلاب اس نے زار کے روس میں بالشویک انقلاب کے عنوان سے بھڑکایا تھا، زار کا روس درحقیقت ایک بہت بڑی سازش کا شکار رہا جو ۱۹۱۷ء میں اس سرزمین پر نافذ کی گئی، روسی قوم یہ سمجھتی ہے، جیسا کہ اس کے ذہن میں ڈالا گیا ہے، بالخصوص مزدوروں اور کسانوں کا طبقہ کہ لینن روسی انقلاب کا بطل وحید ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اشتراکی تحریک کے تمام زعماء یہود تھے اور ٹراٹسکی کی قیادت میں انہوں نے یہ منصوبہ سرانجام دیا۔"

یہودی مصنف جاک لیوے نے لیل شہر کے اپنے ایک ڈاکٹر دوست البرٹ ہوان کو ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو جو خط لکھا ہے اس میں وہ بغیر لاگ لپیٹ کے کہتا ہے:

"میں نے لینن کو زیورچ میں خوب پہچان لیا تھا، جہاں ایسے متعدد اجتماعات منعقد ہوئے تھے جن میں اشتراکی تحریک کے رہنماؤں نے شرکت کی تھی، صہیونی جمعیت کا جنرل سکریٹری حائیم وائس مین بھی اس میں شریک ہوا تھا...... لینن ایک انقلابی آدمی ہے، اُس نے جتنے بھی کارنامے انجام دیے ہیں ان سب میں وہ ٹراٹسکی کا مرہون منت ہے۔ یہ شخص کسی ایسی قوم کی قیادت کا اہل نہیں ہے جس کے عوام پڑھے لکھے اور بیدار مغز ہوں۔"

زیورچ میں لینن اور وائس مین کی ملاقات کے بعد لینن نے برلن کا رخ کیا اور جرمن کی خفیہ پولیس کی مدد سے اسلحہ اور روپے کی بہت بڑی مقدار حاصل کرلی، مارچ ۱۹۱۷ء کو اس نے یہ تمام ساز و سامان مشرقی جرمنی کی روسی سرحد تک پہنچا دیا۔ ہزاروں سپاہی ٹراٹسکی کی قیادت میں وہاں پہلے سے موجود تھے، وہ سب ان اسلحوں سے مسلح ہوگئے اور کسانوں کی بہت بھاری تعداد کو اپنے ساتھ ملا کر دستوں کی صورت میں روس میں گھس گئے۔ شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، زار کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا اور لینن کی صدارت میں مارکسی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔

اعلان بالفور

۷ا/اکتوبر ۱۹۱۷ء کو یہ انقلاب آیا، ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد ہی ایک قرارداد پاس ہوئی جس میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن قرار دیا گیا تھا پھر نومبر ۱۹۱۷ء ہی میں اعلان بالفوراِ سامنے آیا جو لونیل روشچائلڈ ایک یہودی سرمایہ دار اور مسٹر بالفور وزیر خارجۂ برطانیہ کے درمیان دوستانہ روابط کا نتیجہ تھا۔ اسی کا کرشمہ تھا کہ یہودی مساعی کا یہ مثبت نتیجہ برآمد ہوا کہ یہودیوں نے اتحادی طاقتوں سے سرکاری طور پر ایک ایسا راز اگلوالیا جو یہودیوں کی خواہشوں اور آرزوؤں کو بخوبی شرمندۂ تکمیل کرنے والا تھا، ۲/نومبر کو مسٹر بالفور نے اپنے دوست روشچائلڈ کو لکھا کہ فلسطین کے اندر یہودیوں کا قومی وطن اس شرط پر وجود میں لایا جاسکتا ہے کہ اس سے دوسری غیر یہودی اقوام کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

روس میں کمیونسٹ انقلاب کی تاسیس کرنے والے بیشتر یہودی تھے، لینن، اسٹالن کی بیوی روزہ، ٹراٹسکی، کامنیف، سوکو، لانکوف اور زینوویف سب یہودی تھے، البتہ اسٹالن، مولونوف اور فوروشیلوف یہودی نہ تھے، ایک سال بعد لینن نے جو وزارت بنائی تھی اس میں پانچ سو بتیس اشخاص میں چار سو پچیس یہودی تھے، پھر یہودیوں کا یہ غلبہ آغاز ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ۱۹۶۵ء میں ایک روسی مصنف نیتا ازی کزیفا نے لکھا تھا کہ سوویت یونین میں یہودیوں کی تعداد ایک فیصد سے زیادہ نہیں ہے، لیکن یونیورسٹیوں، کالجوں اور شعبہ نشر و اشاعت کے اہم مناصب پر ۶۰ فیصد اُن ہی کا غلبہ ہے اور پارٹی کے دستوری مناصب ۸۰ فیصدی ان ہی کے قبضے میں ہیں، نائب وزیر اعظم اور سوویت اقتصادی مجلس کا صدر ایک یہودی ہی ہے جسے سوویت یونین کے سورما کا تمغہ بھی مل چکا ہے پھر مزید برآں سپریم سویٹ کا صدر بریژنیف بھی یہودی ہے۔

اسٹالین اگر چہ یہودی نہ تھا لیکن در پردہ یہودیوں کی حمایت کرتا رہتا تھا، یالٹا کانفرنس ۱۹۴۵ء میں تین سربراہوں چرچل روز ویلٹ اور اسٹالن کے مابین جو خفیہ مذاکرات ہوئے ان کی روداد پڑھیے اور اسٹالن کی اسرائیل نوازی پر عش عش کیجیے، صدر روز ویلٹ کے ایک قریبی

سیاست داں جان سوریل کا بیان ہے کہ اس وقت اسٹالن اپنے برطانوی اور امریکی رفقاء کی نسبت یہودیوں کے معاملہ میں زیادہ جذبات ہمدردی اور جوش وخروش کا مظاہرہ کرتا رہا وہ کہتا تھا کہ یہ مظلوم قوم ہے جس کے تیس لاکھ افراد مشرقی یورپ میں اور ڈھائی لاکھ افراد مغربی یوروپ میں جرمن گسٹاپو کی تیغ ستم کا شکار ہوئے ہیں، جان سوریل اپنی کتاب 'یالٹا سے پوٹسڈم تک' میں لکھتا ہے:

''سوویت یونین کے سربراہ اسٹالن نے مطالبہ کیا کہ جرمنی پر عائد کردہ تاوان کو دگنا کیا جائے اور یہودیوں کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ فلسطین کے اندر تیس لاکھ یہودی مہاجروں کی آبادی پر صرف کرسکیں جو سوویٹ یونین اور مشرقی یوروپ سے وہاں ہجرت کر گئے ہیں، مگر چرچل نے بڑے لچک دار ڈپلومیٹک اسلوب میں اسٹالن کو جواب دیا۔ فلسطین کا شاداب علاقہ بہت تنگ ہے، تیس لاکھ یہودیوں کی اس میں گنجائش نہیں ہے، یہودیوں کی ہجرت پر سے پابندی اٹھالینے کے بعد عرب ممالک کے اندر ہنگاموں کی لہریں اٹھ کھڑی ہوں گی اور فلسطین جیسے نازک مقام کے معاملے میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان خونریز کشمکش کا آغاز ہوجائے گا۔ یہ تمام نہایت پیچیدہ مشکلات ہیں برطانیہ بین الاقوامی تعاون کے بغیر تنہا ان مشکلات کو حل نہیں کرسکتا، اسٹالن یہ جواب سن کر مسکرا دیا اور کہنے لگا: ''مشرق کی اقلیتوں کی مشکلات صرف اس صورت میں حل ہوسکتی ہیں کہ اشتراکی نظام کو وہاں رائج کیا جائے، یہ نظام قومی تحریکوں کو ختم کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، ہم نے اس نظام کی بدولت ان تمام قومی تحریکوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے جو سوویت یونین کے اندر پائی جاتی تھیں، اس طرح ہم نے سوویت یونین کو تمام مصائب ومشکلات سے آزاد کرادیا ہے۔'' روزویلٹ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا، ہماری معلومات کے مطابق اشتراکی نظام کے اصول ومبادی یوروپ کے یہودی فلاسفروں نے وضع کیے ہیں، لیکن بایں ہمہ یہ نظام یہودیوں کی منتشر اور پراگندہ قوم کی مشکل کا حل فراہم نہ کرسکا

میرے نزدیک بہتر طریقہ یہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد ایک بین الاقوامی کمیٹی بنائیے جو فلسطین کے عمومی حالات کا مطالعہ کرے اور عربوں اور یہودیوں کے مسائل سمجھ کر ان کے لیے پُرامن حل تجویز کرے۔''

یہ مندرجہ بالا گفتگو اس مراسلہ پر ہوئی تھی جسے صہیونی لیڈروں کی ایک کمیٹی نے اس کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ اس مراسلے میں صہیونیوں نے مطالبہ کیا تھا کہ:

۱۔ جرمنی پر مالی تعاون عائد کیا جائے (اس مالی تعاون کی مقدار ۵/ارب ڈالر تجویز کی گئی اور یہ تاوان ان یہودیوں میں تقسیم کیا جائے جنہیں شدید نقصانات پہنچے ہیں خواہ وہ اس وقت یورپ میں موجود ہیں اور خواہ وہ جو امریکہ اور فلسطین چلے گئے ہیں۔

۲۔ فلسطین کی طرف یہودیوں کی ہجرت پر تمام پابندی اٹھادی جائے۔

۳۔ یہودیوں کو اپنا مخصوص سیاسی وجود تشکیل دینے کے لیے ہر طرح کی امداد دی جائے۔

یہ بات بھی قطعی طور سے ثابت ہے کہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ میں یہودیوں نے جو اسلحہ استعمال کیا وہ انہیں زیادہ تر مشرقی یورپ کے ان ممالک سے ملا تھا جس پر کمیونسٹوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد غلبہ پالیا تھا۔ ماسکو کے حکم سے یہودی مشن کو جو موسیٰ شاریٹ کی قیادت میں حصول اسلحہ کے لیے گیا تھا، یہ اجازت دی گئی کہ وہ رومانیہ اور یوگوسلاویہ کے بحری جہازوں پر اپنی ضروریات کا جنگی سامان لاد کر ہینا کی بندرگاہ تک پہنچائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کمیونسٹ ممالک اسرائیل کی پشت پناہی نہ کرتے اور بھاری اسلحہ اور ہوائی جہازوں سے اسے کمک نہ پہنچاتے تو اس جنگ کے دوسرے مرحلے (جولائی ۱۹۴۸ء) میں یہودی ان دور دراز علاقوں میں ثابت قدم نہ رہ سکتے تھے جو تقسیم کی قرارداد میں شامل ہیں مثلاً صحرائے نقیب یافہ اور گلیل کا مغربی حصہ وغیرہ۔ اسلحہ کی سپلائی کے ساتھ ہی اس سازش کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے جو جنگ بندی کے نام سے جون ۱۹۴۸ء میں یو-این-او کے اندر عربوں پر ٹھونسی گئی۔

کمیونزم اور یہودی

آج عالم اسلام میں پھیلی ہوئی اشتراکی تحریکوں کا جائزہ لیجیے، آپ دیکھیں گے کہ ان کی بنیاد ڈالنے والے یہودی ہیں، انہوں نے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے اشتراکیت کو آلۂ کار بنایا ہے، وہ طبقاتی مساوات معاشی برابری، غریبوں کے حقوق کے تحفظ جیسے دلفریب نعروں اور دعووں کے پس پردہ اپنے رذیل اغراض پورا کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

۱۹۲۱ء میں اسکندریہ میں جوزف روزنبرگ نامی ایک یہودی روسی اور اس کی بیٹی شارلوت نے روسی یہودیوں کو اکٹھا کیا اور انہیں ایک تنظیم کے اندر پرو دیا، پھر وہاں کے مقامی باشندوں کو شامل کر کے کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل کی۔ پھر ۱۹۲۷ء میں موسکو نے دو افراد پر مشتمل ایک وفد روانہ کیا پھر ایک یہودی مصری ہنری کوریبل کو نمائندہ بنا کر بھیجا، اسے کافی سیم و زر کے ساتھ روانہ کیا گیا تھا، چنانچہ اس نے آزادیٔ وطن کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی قائم کی (H.T.O.) رسالہ 'شعلہ' جسے لینن نے جاری کیا تھا اس کی صدارت کی ذمہ داری ایک یہودی عورت ایلی شوارتز پر ڈال دی گئی، پھر اس کا نام بدل کر نحشم '(نحو حزب شیوعی) یعنی' کمیونسٹ پارٹی کی طرف' کر دیا گیا۔ تنظیم 'الفجر الجدید کے بانی یوسف درویش اور ریمون ڈیوک یہودی ہی تھے، پھر اس کا نام بدل کر 'الجبهة الديمقراطية الشعبية' کر دیا گیا۔

مصری کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد دو یہودی اودیت اور اس کی زوجہ سالمیون سدنی نے رکھی، عراق میں کمیونسٹ پارٹی کے بانی، ساسون دلال، ناجی شمیل، صدیقی یہوذا اور یوسف حزقیل ہیں جو سب کے سب یہودی اور عراقی کمیونسٹ پارٹی کے قائدین میں سے ہیں۔

شام اور لبنان میں پولینڈ کے ایک یہودی باشندے جوزف بیرعز کے ذریعے ہی ان تحریکوں کا آغاز ہوا، پھر موسکو نے ایک دوسرے شخص یلیا ہوتا بیر کو متعین کیا پھر تیسرا یہودی ناخمان لیتبنکی اس پر مامور ہوا، آخر میں شامی لبنانی کمیونسٹ پارٹی کی صدارت ایک یہودی جاکوب بیتر کے حصہ میں آئی۔

اردن میں پہلے کمیونسٹ پارٹی نہ تھی لیکن ۱۹۴۸ء کے بعد یہودی کمیونسٹ پارٹی ''راکام'' نے فلسطینی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھ دی جن میں سرفہرست نصرانی فواد نصار تھا جس کے انتقال پر دوسال قبل اسرائیل کمیونسٹ پارٹی کے صدر نے تعزیتی کلمات کہے تھے اور ایک تعزیتی اجلاس بھی منعقد کیا تھا۔

روسی امداد کا اصلی محرک

بعض لوگ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ سوویت روس ہمارے ساتھ امن پسندانہ وطنی رویہ برتتا ہے کیوں کہ وہ واحد ملک ہے جو صدق دل سے آزادی وطن کی تحریکوں کی حمایت کرتا ہے لیکن اس کی تردید کے لیے روسی کلچرل اتاچی کی وہ تردید کافی ہے جو اس نے ۱۹۶۴ء میں اسرائیلی اخبار معاریف کے ایڈیٹر سے ملاقات کے وقت کی تھی، اسرائیلی ایڈیٹر نے پوچھا تھا کہ آخر آپ حضرات مصر اور عالم عرب کو اسلحہ کی سپلائی کیوں کرتے ہیں کیا اس سے ہمارے مقاصد کو نقصان نہیں پہنچے گا؟

۲۲ر جولائی ۱۹۶۴ء کو اس نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

> ''ہم عربوں کا ساتھ صرف اس لیے دے رہے ہیں کہ وہ استعمار اور عربی رجعیت کا بھرپور مقابلہ کرسکیں، جمہوریہ متحدہ عرب کا تعاون صرف اس لیے ہے کہ وہ رجعت پسند عرب تحریکوں کو ملیامیٹ کر سکے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اسرائیل کے خلاف ان ہتھیاروں کے استعمال پر خاموش رہ سکیں گے، عالم عرب میں سوویت روس کی سیاست سے آپ حضرت پریشان نہ ہوں یہ تو اسرائیل کی صحت وسلامتی اور وجود وبقا کے لیے ضروری ہے، آپ مطمئن رہیں، سوویت یونین آج بھی اسرائیل کی اسی طرح حمایت کرے گا جس طرح اس نے ماضی میں کی ہے، ہماری طرف سے آپ کو کامل اطمینان ہونا چاہیے کہ ہم عرب اشتراکیت کی ہم نوائی اسرائیل کے مفادات کی

خاطر کر رہے ہیں، جس طرح خود ہمارا اپنا مفاد پیش نظر ہے۔"

گرومیکو کی عرب دشمنی

اور کامریڈ گرومیکو[1] کی عرب دشمنی تو مشہور ہے جب اقوام متحدہ کے ہنگامی اجلاس ۲۸ر اپریل سے ۱۵رمئی ۱۹۴۷ء تک میں فلسطین کا مسئلہ زیر بحث آیا تو مشرقی بلاک نے روسی نمائندے کامریڈ گرومیکو کے زیر قیادت اپنی ساری طاقت اس بنیادی نقطے پر مرکوز کیے رکھی کہ کسی طرح اقوام متحدہ سے فلسطین میں یہودی وجود کی قانونی حیثیت کو تسلیم کروالیا جائے۔

عرب ممالک کے مندوبین نے اس اجلاس میں ایک میمورنڈم پیش کیا[2] جس میں اقوام متحدہ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ فلسطین سے برطانوی انتداب اٹھا دیا جائے اور فلسطین کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس مطالبے کے جواب میں روسی نمائندے گرومیکو نے عرب نمائندوں پر تند و تلخ حملہ کیا، ۲۹ر اپریل کے اجلاس میں اس نے واشگاف الفاظ میں کہا.

> "فلسطین میں یہودی قوم اپنا وجود رکھتی ہے، اس قوم کے احساسات کا لحاظ اور اقوام متحدہ کے اندر اس کی آواز پر کان دھرنا ضروری ہے، اقوام متحدہ کی کوئی طاقت اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ کوئی ایسی قرارداد منظور کرے جو عربوں کے مطالبے کی حمایت میں فلسطینی قوم کے استقلال کے اعلان کی تائید کرے۔"

۲رمئی کے اجلاس میں اس نے کہا:

> "فلسطین کا جھگڑا بذاتِ خود اور اپنے تاریخی مزاج کی رو سے یہ لازم ٹھہراتا ہے کہ یہودیوں کو اس جھگڑے کے حل میں شرکت کو موقع دیا جائے۔ یہ جھگڑا اور در اصل یہودی قوم ہی کا مسئلہ ہے۔"

گرومیکو کی تائید کرتے ہوئے چیکوسلواکیہ کے کمیونسٹ نمائندے جان بابا نک نے کہا:

> "یہودی قوم کے مطالبات عین حق و انصاف ہیں یہودیوں نے برطانوی انتداب

سے طویل مدت پہلے فلسطین کی تعمیر وآباد کاری شروع کر دی تھی، فلسطین پر یہودیوں کے حقوق نہ صرف تاریخی طور پر درست ہیں بلکہ قانوناً بھی صحیح ہیں۔''

پولینڈ کے کمیونسٹ نمائندے جوزف وٹیوٹز نے اپنی باری آنے پر کہا:

''قضیہ فلسطین کے بارے میں کسی فیصلہ پر بھی اس وقت تک غور وخوض نہیں کیا جاسکتا، جب تک جنرل اسمبلی کی کارروائیوں میں یہودی ایجنسی کا حق نہ دیا جائے، پولینڈ کی حکومت یہودی قوم کے مفادات اور اس کے مستقبل سے پوری دلچسپی رکھتی ہے۔''

سیاسی کمیٹی کا اجلاس ایک ایسی قرارداد پر ختم ہوا جس میں طے کیا گیا کہ مسئلہ فلسطین کے مطالبہ اور تحقیق کے لیے ایک بین الاقوامی کمیٹی تشکیل کی جائے گرومیکو نے اس اجلاس میں اسٹیج پر چڑھ کر اعلان کیا:

''یہودی قوم جینے کے لیے پیدا ہوئی ہے اسی طرح دیگر قومیں آزاد زندگی کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں، یہود مسلسل المیوں اور اکھیڑ پچھاڑ اور تعذیب تشدد کا نشانہ بنتے رہے ہیں، اب اقوام متحدہ کا فرض ہے کہ وہ ان کی آرزوؤں کو پورا کرے اور فلسطین میں ان کے حقوق کو تسلیم کرے، فلسطین اس قوم کی تاریخ اور عمیق تہذیب کا گہوارہ ہے، عالمی تحقیقاتی کمیٹی کا بھی فرض ہے کہ وہ اس ملک میں یہودی قوم کے حاصل کردہ حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھے۔''

سلامتی کونسل کے اجلاس سے تھوڑی دیر پہلے امریکی حکومت نے ایک خفیہ اجلاس میں تقسیم فلسطین کی قرارداد سے دستبردار ہو جانے کا فیصلہ کیا اور طے کیا کہ فلسطین کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کی تجویز زیر بحث لائی جائے، امریکی حکومت نے اپنے نمائندے مسٹر اسٹن کو ہدایت کی کہ وہ اس تجویز کو سرکاری طور پر کسی موزوں اجلاس میں پیش کرے، امریکی نمائندے نے جب یہ تجویز سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی تو روس کا نمائندہ گورومیکو اس تجویز پر برس پڑا۔ اس نے کہا:

''نئی تجویزوں اور حلوں کی تلاش میں تضییع اوقات سے کچھ حاصل نہیں ہے، تقسیم ہی قابلِ قبول حل ہے۔ یہی حل یہودی قوم کو جو ماری ماری پھرتی ہے اور طرح طرح کے مصائب میں گھری ہوئی ہے، استقرار بخش سکتا ہے اور فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی ضمانت دے سکتا ہے، سلامتی کونسل کو کسی ایسی قرارداد کے اندر ترمیم یا تبدیلی کا کوئی حق نہیں ہے، جسے جنرل اسمبلی منظور کر چکی ہو، امریکہ نے جو نئی تجویز پیش کی ہے یعنی تقسیم کے بجائے فلسطین کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کی تجویز، اس سے اس کا مقصد صرف عربوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہے تاکہ امریکہ اپنے تیل کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔''

اقوامِ متحدہ میں یوگوسلاویہ کے نمائندے نے گرومیکو کی رائے پر زور دیتے ہوئے کہا:

''ہم فلسطین کی تجویز قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں فلسطین یہودیوں اور عربوں دونوں کا وطن ہے، یہود اگر فلسطین کے اندر اشتراکی اور جمہوری نظامِ زندگی کو رواج دیں گے تو اس سے خود عربوں کو بھی استفادے کا موقع ملے گا جو اس نظام کے شدید حاجت مند ہیں عربوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہودیوں کی قربانیوں کی قدر کریں اور بے سود دشمنی سے باز آ جائیں۔''

بولونیا کے نمائندہ نے کہا:

''استعمار کے خلاف جنگ میں عرب اور یہود دونوں کے لیے بے شمار فوائد ہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر امریکہ اسرائیل کو اسلحہ کی سپلائی کرتا ہے تو ہتھیار فراہم کرنے کے لیے امداد روس سے ملتی ہے، کمیونسٹ ہی تمام واقعات و حادثات میں قیادت کرتے ہیں وہ شروع سے یہودیوں پر شفیق رہے ہیں اور یہودیوں کی سیاست کی مخالفت بھی نہیں کر سکتے، اس لیے کہ کمیونسٹ انقلاب از اول تا آخر یہودی انقلاب ہے۔''

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مغرب اور مشرق دونوں بلاکوں نے مل کر اسرائیل

کی تشکیل کی ہے۔ دونوں عالم اسلام کے خلاف ہیں اور در پردہ یہود کی ہم نوائی اور پشتیبانی کررہے ہیں، ان میں سے کوئی بھی عالم اسلام کا حقیقی بہی خواہ نہیں ہے۔

☆☆☆

حواشی وتعلیقات

۱۔ اعلان بالفور (Balfour Declaration) ۲رنومبر ۱۹۱۷ء، دراصل اُس برطانوی حمایت اور سیاسی تائید کا اعلان ہے جو ''ارض فلسطین میں یہودیوں کے ایک قومی وطن کی تشکیل کے لیے'' دی گئی ۔ یہ حمایت برطانوی خارجہ سکریٹری آرتھر جیمس بالفور (Arthur James Balfour) کے اس خط میں کی گئی تھی جو اس نے برٹش جیوری کے ایک سیاست داں Lionel Walter Rothschild کے نام لکھا تھا۔ یہ اعلان لندن میں سرگرم صہیونی رہنما حائیم وائس مین اور ناہم سکولوف (Nahum Skolow) کی پیہم کوششوں کا نتیجہ تھا مگر صہیونی دہشت گردوں کی نگاہ میں، جو فلسطین کو قومی یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے، یہ اعلان توقعات سے بہت کم تر ثابت ہوا۔ اعلان بالفور نے ضمانت دی تھی کہ ''کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جائے گا جس سے فلسطین میں رہنے والے غیر یہودی باشندوں کے تمدنی و مذہبی حقوق پر زد پڑے'' مگر صہیونی رہنماؤں نے اس کا پاس ولحاظ نہ کیا اور عالمی صہیونی تنظیم کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس اعلان کا استعمال کیا۔ اس اعلان کو تمام حلیف طاقتوں نے من وعن تسلیم کیا اور اسے فلسطین پر برطانوی انتداب کے مسودہ میں بھی شامل کرلیا گیا اور آخر کار ۲۴ر جولائی ۱۹۲۲ء کو مجلس اقوام نے بھی اسے منظور کرلیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: The New Encyclopaedia Micropaedia, Britannica، جلد اول، ص ۸۳۱-۸۳۲

۲۔ آندرے گرومیکو (۱۹۰۹-۱۹۸۹ء) Andrey Andreyevich Gromyko سوویت وزیر خارجہ (۱۹۵۷ء سے ۱۹۸۵ء تک) سپریم سوویت پریسیڈیم کا صدر (۱۹۵۸ء سے ۱۹۸۸ء تک) جس نے کسی متعین پالیسی یا سیاسی دھڑے سے اپنے کو وابستہ نہیں رکھا اور ہمیشہ اس نے پیشہ ورانہ مہارت اور گفت وشنید میں بالادستی کا مظاہرہ کیا، اپنی معلومات اور فن مکالمہ میں

چابکدستی اور تیزی وطراری میں مشہور رہا۔

۳۔ اقوام متحدہ کے اجلاس ۲۸/اپریل - ۱۵/مئی ۱۹۴۷ء میں فلسطین کے مسئلہ پر بحث کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: مصطفیٰ محمد الطحان، فلسطین - المؤامرة الکبریٰ، اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد سمیع اختر، ''فلسطین - سازشوں کے نرغے میں''، ہلال پبلی کیشنز، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، ص ۲۵۲-۲۶۶۔ مسئلہ فلسطین پر سیاسی دستاویزات کے مفصل مطالعہ کے لیے دیکھیے ظفر الاسلام خان کی معروف تحقیقی کتاب: Palestine Documents, compiled, annotated and partly translated from Arabic by Zafarul Islam Khan, Pharos. N. Delhi. 1998.

روسی مسلمانوں سے بے وفائی

امام شاملؒ کا جہاد

یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ روسی زار شاہی کو دبانے میں مسلمانوں نے کمیونسٹوں سے کم قربانی نہیں دی ہے۔ داغستان کی جنگیں روسی سامراج کے مقابلے میں مسلمانوں کی مزاحمت کا حیران کن اور عظیم الشان باب کا حصہ ہیں۔ اہل داغستان ۱۵۹۴ء سے ۱۸۵۹ء تک ملک کے چپہ چپہ کے لیے جنگ کرتے رہے۔ مزید اس تحریک نے اس میدان میں نہایت قابل ذکر کارنامے انجام دیے۔ امام شاملؒ اس تحریک کے آخری امیر تھے جو ۱۸۳۴ء سے ۱۸۵۹ء تک مسلسل ۲۵ برس روسیوں سے لڑتے رہے اور انہیں تگنی کا ناچ نچاتے رہے۔

امام شاملؒ تیغ وقلب کے دھنی تھے۔ ان کا شمار ملک کے کبار مشائخ میں ہوتا تھا وہ ایک معتبر عالم دین اور گوناگوں اوصاف اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک بہترین سپہ سالار اور اعلیٰ درجہ کے منتظم تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونکی روسی فوجوں کو پے در پے ہولناک شکستیں دیں۔ لیکن مسلح روسی فوج کا کب تک مقابلہ کرتے۔ رفتہ رفتہ ان کی قوت گھٹتی گئی اور وہ محصور ہوتے چلے گئے۔ ایک ترک مصنف کے الفاظ میں 'انہوں نے ایک ایک شہر اور ایک گاؤں کے لیے جنگ کی، یہاں تک کہ آخری مسجد کے لیے بھی مقابلہ کیا' امام شامل، ان کے اہل خاندان اور مٹھی بھر ساتھی، جو زندہ بچ رہے تھے، گرفتار کر لیے گئے، اور داغستان ایک طویل اور عظیم مزاحمت کے بعد روسی سامراج کا غلام بن گیا۔ ان لڑائیوں میں روسی افواج جس عظیم نقصان اور تباہی سے دوچار ہوئیں اس کا ذکر کرتے ہوئے روس کے فوجی مؤرخ جنرل؛ قاد یسیف نے لکھا:

''کوہستانی قفقاز کے ساتھ لڑائی میں ہمیں اتنے بڑے لشکر سے ہاتھ دھونا پڑے جو

ہندوستان سے جاپان تک پھیلے ہوئے ملک فتح کرنے کے لیے کافی تھا۔‘‘

امام شامل اوران کے ساتھیوں کی شجاعت و بسالت کو کارل مارکس نے بھی خراج تحسین پیش کیا ہے اوران کی جدو جہد آزادی کو دوسری قوموں کے لیے ایک عظیم الشان سبق قرار دیا ہے۔

زارشاہی کے خلاف مسلمانوں کی یہی وہ عظیم الشان قربانیاں تھیں جنھوں نے ان کو سوویٹ انقلاب کے بعد اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے پر ابھارا۔ ظاہر ہے وہ زارشاہی کو ختم کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا چکے تھے اب اس کے خاتمہ کے بعد انہیں بجا طور پر یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ آزاد ہوں اور اپنی آزادانہ زندگی کی بابت کوئی فیصلہ کریں، چنانچہ اکتوبر انقلاب سے پہلے ان کی متعدد کانفرنسیں ہوئیں جن میں نئے انقلاب میں مسلمانوں کے مستقبل کی بابت غور و خوض کیا گیا۔ ۱۹۱۷ء اپریل میں قازاق اور قراقز کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس اور بزگ میں ہوئی۔ مئی ۱۹۱۷ء میں تمام روسی مسلمانوں کی میٹنگ موسکو میں ہوئی لیکن اس وقت مسلمانوں کی کئی جماعتیں سرگرم عمل تھیں ایک تو ترکستان ملی کمیٹی تھی، دوسری شورائیہ اسلامیہ اور تیسری نوجوان ترکستان یا جدید پارٹی تھی اس افتراق کا نقصان یہ تھا کہ مسلمان کوئی متحدہ موقف نہ اختیار کر سکتے تھے اور ترکستانی مسلمانوں کو تاشقند سوویٹ نئی حکومت میں حصہ دار بنانے کے لیے بالکل آمادہ نہ تھی۔ اس کے ایک لیڈر نے تاشقند میں اعلان کیا تھا:

’’انقلاب روسی مزدور اور فوجی لائے ہیں، اس لیے انقلاب کی رہنمائی بھی وہیں کریں گے، ترکستانیوں کو وہ جو کچھ دیں گے اس پر انہیں قناعت کرنا ہوگی۔‘‘

روسیوں کی اس روش کے نتیجہ میں مسلمانوں میں مشترکہ پلیٹ فارم کا احساس پیدا ہوا۔ تاشقند ہی میں کُل ترکستان مسلم کانگریس منعقد ہوئی جس نے روس میں وفاقی نظام قائم کرنے اور روسی آبادکاروں کو ملک کے حقیقی باشندوں کی زمینوں سے بے دخل کرنے کی قراردادیں منظور کیں، اور مسلمانوں کے تمام گروہ ملّی شوریٰ میں مدغم ہوگئے۔ ہر صوبے میں اس کی شاخیں وجود میں آگئیں۔ مرکزی ملی شوریٰ کے لیے ہر صوبہ سے ایک ایک نمائندہ لیا گیا۔ مصطفیٰ چوتائی صدر

منتخب ہوئے۔ اس طرح مسلمانوں کی متحدہ قوت ابھر کر میدان میں آ گئی

دسمبر ۱۹۱۷ء کی ایک پُرفریب اپیل

کمیونسٹ لیڈروں نے جب ترکستانی مسلمانوں کی اسلام سے محبت اور ان کی متحدہ قوت کا مشاہدہ کیا اور انہیں اس کا احساس ہو گیا کہ ابھی ہم قوت و طاقت کے لحاظ سے کمزور ہیں اور حالات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ ان کے ساتھ علانیہ جنگ چھیڑی جائے تو انہوں نے لینن کی زیر قیادت عوامی نمائندوں کی کونسل کی جانب سے روس کی مسلم آبادیوں کے نام ایک اپیل نشر کی جس میں کہا گیا:

> ''روس کے مسلمانوں کے نام، خواہ وہ وولگا کے تاتاری ہوں یا جزیرہ نمائے قرم کے باشندے، سائبیریا اور ترکستان کے کرغز اور سارلمی، ماورائے قوقاز کے ترک اور تاتاری، قوقاز کی پہاڑی آبادیاں اور چرکس، ان تمام لوگوں کے نام جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں اور جن کے عقائد و روایات روس کے زاروں اور سفاکوں نے پامال کی ہیں۔
>
> آگاہ ہو کہ تمہاری تمام روایات و عقائد اور تمہارے قومی و ثقافتی ادارے آج سے آزاد ہوں گے اور ان سے کوئی تعرض نہ کرے گا۔ تم اب پوری آزادی کے ساتھ کسی غیر کی دراندازی اور رکاوٹ کے بغیر اپنی قومی زندگی کی تنظیم کرو...... اس کا تمہیں پورا پورا حق ہے۔ ہم اپنے پھریروں پر دنیا کی تمام مظلوم اقوام کی آزادی کا شعار نقش کرتے ہیں۔''

اس اپیل سے پہلے حکومت روس کی طرف سے ایک بیان انہی لیڈروں کے دستخطوں سے ۱۵ نومبر ۱۹۱۷ء کو جاری ہوا اس بیان میں کہا گیا کہ 'روسی اقوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیں۔ یونین سے علیحدگی اور کامل آزادی کا بھی فیصلہ کر سکتی ہیں۔ تمام قومی

اور مذہبی امتیازات اور پابندیوں کو منسوخ کرنے کا بھی۔"

اپریل ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ پارٹی کی ساتویں کل روس کانفرنس نے ایک اور قرارداد منظور کی تھی جس کے چار بنیادی نکات تھے:

۱۔ تمام غیر روسی قومیتوں کو روس سے الگ رہنے کا حق حاصل ہے۔

۲۔ روسی حدود میں تمام اقلیتوں کو قانونی ضمانت حاصل ہوگی۔

۳۔ تمام قومیتوں کو صوبائی خودمختاری حاصل رہے گی۔

۴۔ ایک ملی وحدت تشکیل دی جانی چاہیے۔

سرخ جبر و تشدد

جب ترکستان کے مسلمانوں نے اس اپیل اور بیان کے بعد اپنی آزاد حکومت کی تشکیل کر لی جو عوام کی آزاد خواہش کی آئینہ دار تھی تو سوشلسٹ لیڈران بوکھلا گئے۔ سوویت حکومت کی طرف سے قومیتوں کے کیسار استالن نے لکھا:

> "علاقائی سوویت حکومتیں اپنے داخلی معاملات میں خودمختار ہیں، اور اپنی حقیقی طاقت پر انحصار کر کے اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔ اس لیے ترکستان ملکی پرولتاریوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ مرکزی حکومت کو درخواست بھیجیں اور عوامی کیساروں کو ترکستانی کونسل کو توڑ دینے کی اپیل کریں جو ان کی رائے میں غیر مسلم فوجی عناصر پر اعتماد کر رہی ہے، بلکہ اگر ملکی پرولتاریوں اور کسانوں کے پاس طاقت ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ اس ملک کو بزور تیغ ختم کر دیں۔"

چنانچہ جنوری ۱۹۱۸ء میں اورنبرگ کے محاذ پر کمیونسٹوں کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ پھر ۱۴ فروری ۱۹۱۸ء کو دارالحکومت خوقند پر شدید جنگ کے بعد روسی افواج نے قبضہ کر لیا۔ کمیونسٹوں نے تین دن تک شہر میں قتل و خونریزی اور لوٹ مار کا بازار گرم کیے رکھا۔ اس قتل عام میں کتنے لوگ مارے

گئے؟ آج تک صحیح جواب نہیں مل سکا۔ ایک اندازے کے مطابق چودہ ہزار آدمی مارے گئے، خود کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ عہدیدار گورکی، مولوٹوف، وارشلوف، کیروف اور اسٹالن اس قتل عام کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے، انہوں نے اپنی مرتب کردہ نیم سرکاری تاریخ روس میں خانہ جنگی کی تاریخ کی پہلی جلد میں خوقند کی لوٹ مار کے سلسلہ میں لکھا:

"یہ بہت سے مقامی بالشویکوں نے قومی مسئلے سے متعلق بالشویک پارٹی کی پالیسی مسخ کردی اور دیسی آبادی سے پیش آتے وقت سنگین غلطیوں کا ارتکاب کیا۔"

سوویت حکومت نے پوری کوشش کی کہ ان مظالم کی خبر پھیلنے نہ پائے۔ لیکن ایسا ہولناک واقعہ کس طرح پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ ہر طرف نفرت اور غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ۲/ مارچ کو سوویت فوجی انقلابی کمیٹی نے فرغانہ کی آبادی سے اپیل کی کہ عوام کے دشمن جو افواہیں پھیلا رہے ہیں، ان پر بالکل یقین نہ کریں۔۔ اس سے ایک روز پہلے سوویتس کی علاقائی کانگریس نے قومی انقلابی کمیٹی کو حکم دیا کہ سرخ افواج عوام کے سامنے آنے سے گریز کریں۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں بڑھتی ہوئی نفرت کسی نئی جنگ کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ ان ہدایات کے باوجود سرخ فوجی اینڈتے اور خوقند میں لوٹا ہوا مال مختلف شہروں میں علانیہ فروخت کرتے پھر رہے تھے۔

خوقند میں لوٹ مار

اس زمانے میں ایک روسی مبصر اونسکی نے لکھا 'خوقند قبرستان میں تبدیل ہو چکا ہے۔' جن سادہ لوح مسلمانوں نے سوشلسٹ انقلاب کے دکھاوے کے دانتوں اور بلند آہنگ و دلفریب نعروں سے مسحور کر روسیوں کا ساتھ دیا تھا وہ ان کا گھناؤنا کردار دیکھ کر بھونچکے رہ گئے انہوں نے سوویت حکمرانوں سے ایک عرضداشت کے ذریعہ زبردست احتجاج کیا:

"سرخ پرچم تلے گھناؤنے افعال کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ انقلاب سے پہلے جبر وتشدد کی جو حکومت ہم پر مسلط تھی، اسے اب پھر تقویت پہنچائی جا رہی ہے اور ان چھوٹی

قومیتوں کے خلاف کھلی جنگ چھیڑ دی گئی ہے جو انقلاب کے ایک عظیم کارنامے، حق خود اختیاری کے تصور کو اپنی زندگی میں عملی صورت دینے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ اس (سوویت حکومت) نے ان لوگوں کی سرزمینوں پر انسانی خون کے دریا بہا دیے ہیں، ان کی حکومتیں ختم کر دی ہیں اور ان کمزوروں اور بے بسوں پر ایسے مظالم ڈھائے ہیں کہ ان کے آگے سابقہ حکومت کا ظلم و ستم گرد ہو کر رہ گیا ہے۔ حال ہی میں اس نے خوقند کی گلیوں میں انسانی خون چھڑکا، پرانے شہر کو جس میں مسلمان رہتے تھے، زمین کے برابر کر دیا۔ ہزاروں بے گناہ اور نہتے مسلمانوں کو قتل کر دیا اور ان کا تمام مال و متاع لوٹ لیا۔"

مسلمانوں سے فریب

کمیونسٹوں نے قتل و غارت ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ پورے علاقہ میں فوجی ضرورت کے نام پر خوراک کے ذخائر بھی ضبط کر لیے اور غلہ کی درآمد پر پابندی لگا دی۔ نتیجہ یہ کہ سارا علاقہ ہولناک قحط کی لپیٹ میں آ گیا۔ اور ۲۵ سے ۵۰ فیصد تک آبادی ہلاک ہو گئی۔ چینی ترکستان میں متعین برطانوی قونصل کرنل پی ٹی اتھرٹن نے لکھا '۹ لاکھ اشخاص اس قحط کا شکار ہو گئے۔ اور ہزاروں نے بھاگ کر چینی ترکستان میں پناہ لی۔' رچرڈ پائپس اپنی کتاب The Heart of Asia میں لکھتا ہے 'انقلاب سے پہلے خوقند کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ جو ۱۸۲۶ء میں صرف ۶۹ ہزار تین سو رہ گئی۔'

کمیونسٹ پارٹی کی سالانہ کانفرنس میں لینن نے کہا تھا کہ دوسری اقوام کے مقابلے میں قراقز، ازبیک، تاجک اور ترکوں کے ساتھ خاص معاملہ روا رکھا جائے ماضی میں ان پر علماء دین کی حکومت تھی۔ یہ اسلام کے شیدائیوں میں سے تھے۔ اس لیے ان کو راہ راست پر لانے کے لیے تدریجی طریقہ اپنایا جائے۔ اس وقت کا انتظار کیا جائے جبکہ پرولتاوی عناصر ان بورژوا عناصر پر

غالب آ جائیں۔اور خود ہی صفایا شروع کر دیں۔

زاران روس کا ظلم وستم

مسلمانوں نے زاران روس کے خلاف جب تحریکی مہم کا آغاز کیا اور اپنے حقوق ومطالبات کی آواز اٹھائی۔تو ان پر شدید مظالم توڑے گئے،ان مظالم کی روداد بڑی دلگداز ہے۔خاص طور پر زار پیٹرو کے دور میں یہ ظلم وستم انتہا کو پہنچ گیا۔پیٹرو نے ۳رنومبر ۱۷۱۳ءکو یہ فرمان جاری کیا کہ ان علاقوں کے غیر روسی باشندے اگر ۶ ماہ کے اندر اندر عیسائی مذہب قبول نہ کریں گے تو ان کی زمینیں اور املاک ضبط کر لی جائیں گی۔مسلمانوں نے اس ظالمانہ حکم کا بڑی شجاعت اور پامردی سے سامنا کیا۔اور سخت مصائب وآلام کے باوجود اسلام سے دستبردار نہیں ہوئے۔جبر وتشدد کی تلوار پون صدی عوام کی گردنوں پر لٹکی رہی۔یہاں تک کہ ۱۷۸۵ءمیں کیتھرائن دوم کا دور حکومت آیا اور اس نے کچھ نرمی کا رویہ اپنایا۔چونکہ ملکہ کیتھرائن کریمیا اور دوسرے مسلمان علاقوں تک روس کی سرحدیں بڑھانا چاہتی تھیں،اس لیے اس نے داخلی مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی۔مسلمان زعماء اور علماء نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی مذہبی سرگرمیوں کو منظّم کیا۔اور مطبوعات اور کانفرنسوں کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر مذہبی اور قومی بیداری کی روح پھونکی۔

۱۹۱۷ءکے انقلاب کے موقع پر مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے مطالبات اور آرزوؤں کو شرمندۂ تعبیر کریں۔کمیونسٹ لیڈروں نے بھی ایسے بیانات جاری کیے۔جن سے یہ واضح تھا کہ روسی اقوام کو حق خود ارادیت حاصل ہے۔اور وہ اپنی الگ آزاد حکومتیں قائم کر سکتی ہیں۔پھر اسٹالن نے مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے لیے ان کا ایک بااختیار نمائندہ گروہ منتخب کیا۔جو اپنی مشکلات اس کے سامنے پیش کرے۔اور اس کا نام 'کمیونسٹ مسلمانوں کی روسی پارٹی' رکھا۔پھر اسٹالن نے اس پارٹی کو توڑ دیا۔اور وہ ساری ذمہ داریاں اور اختیارات 'روسی کمیونسٹ پارٹی کے زیر نگرانی اسلامی انجمنوں کے سینٹرل آفس' کے حوالے کر دیے جیوفری ہوڈ کا

بیان ہے کہ مارچ ۱۹۱۹ء میں اسٹالن نے اس کا نام بھی بدل کر 'مشرقی قوم کی انجمن' رکھ دیا۔ اس طرح مسلمانوں کے اختیارات ان کے حقوق اور ان کے مسائل کی نمائندگی بھی ٹھیک اس طرح بدل گئی جس طرح اکتوبر انقلاب کے بعد اسلام کا مفہوم بدل کر رکھ دیا گیا تھا۔

ثقافتی یلغار

اسلام کا مفہوم بدلنے کے لیے اور اس کے دائرے کو محدود سے محدود تر کرنے اور بالآخر اسے ختم کرنے کے لیے بہت سی قانونی کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ ترکستان کے طول وعرض میں 'الحادی یونین' کی شاخیں کھول دی گئیں اور مذہب کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم چلانے کے لیے ماہرین کی تربیت کا کام شروع ہوگیا۔ ماسکو کے اندر 'خدا بیزار' دہریت پسند اشاعتی ادارے حرکت میں آگئے اور مذہب کے خلاف اخبارات ورسائل اور کتابوں اور اشتہاروں کی بارش شروع ہوگئی۔

الحادی یونین کی مرکزی کونسل کے صدر روی باروسلادسکی نے کہا کہ مذہب کے خلاف جنگ ہی کش مکش کا ایک حصہ ہے، جس کی دعوت لینن کے اصول پیش کرتے ہیں۔ الحادی یونین کی شاخوں نے اسلام پر حملہ کرنے کا یہ نرالا طریقہ اختیار کیا کہ علماء اور دین پسند عناصر پر رکیک حملے کیے اور مزدوروں اور کاشتکاروں کے اندر ان کے خلاف من گھڑت افسانے پھیلائے۔ ان کے اخلاق اور کردار کے نہایت گھناؤنے واقعات پیش کیے اور ایسی فحش اور خانہ زاد جنسی داستانیں ان سے منسوب کیں جن کی سرے سے کوئی بنیاد نہ تھی بلکہ موقع بموقع علماء کو دھمکیاں بھی دیں اور آخر میں تو اسلام اور علماء اسلام کی تطہیر کا مکمل منصوبہ زیر عمل لایا گیا جس کی تفصیل میں جانا طول لاحاصل ہے۔

جب کمیونسٹ پارٹی کے ذمہ داروں سے مسلمانوں کی حق خود ارادیت اور لینن کے اعلان آزادی کے سلسلہ میں سوال کیا جاتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ 'ہاں ہم حق خود ارادیت کا اعلان کرتے

ہیں ماضی میں بھی کیا تھا اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ لیکن اس وقت جبکہ یہ حق جاگیرداری، سرمایہ داری اور امپریلزم کے خلاف استعمال کیا جائے۔ اگر اسے بورژوا طبقہ پرولتاریہ کے مقابلے میں استعمال کرے اور اپنے سامراجی فوائد کو تقویت دینے کی کوشش کرے تو ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اس وقت ہمارا رویہ بالکل مختلف ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک ان کی حکومت مضبوط و مستحکم نہیں ہوئی تھی اور انہیں مسلمانوں کی رضا مندی درکار تھی اس وقت تک رویہ مداہنت و مصالحت کا رہا لیکن جب مسلمان قوم کی چوٹیاں ان کے ہاتھوں میں آگئیں۔ اور وہ مجبور و بے بس ہو گئے تو ان کے سارے وعدے کافور ہو گئے سارے منصوبے اور اعلانات سبز باغ ثابت ہوئے اور دیکھتے دیکھتے خرمن اسلام سرخ انگاروں سے جل کر خاک ہو گیا۔

شراب ایک ہے، بدلے ہوئے ہیں پیمانے

اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے روس کی بعض آبادیاں پوری کی پوری مسلمانوں پر مشتمل تھیں اور زاران روس کے جبر و تشدد کے باوصف انہیں اپنے داخلی معاملات میں کچھ نہ کچھ آزادی بھی حاصل تھی اور ان کی قومی و ملی اور تاریخی شخصیت بھی محفوظ تھی بعض آبادیوں میں گو کہیں مسلمان بڑی اور کہیں معمولی اقلیت میں تھے مگر جگہ جگہ ان کی ایسی بستیاں اور مرکز قائم تھے جو انکے تشخص اور ان کی تہذیب و ثقافت کو برابر نشو و نما دے رہے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں زار کے عہد حکومت میں جبکہ مارشل لا نافذ تھا روسی مسلمانوں کی ایک کانفرنس ۵/ اگست کو گستاف ستورہ نامی بحری جہاز میں منعقد ہوئی تھی۔ کانفرنس کے کرتا دھرتا قاضی عبدالرشید لکھتے ہیں:

> ''ترک مسلمان اپنی آزادی کے دروازے تک پہنچ چکے تھے کہ کمیونزم نے سر اٹھایا اور مسلمانوں کو پھر پیچھے دھکیل دیا خدا کی قسم کمیونسٹ آزادیوں کے قاتل ہیں۔ دونوں سامراجوں میں کتنا فرق ہے۔ ایک سامراج وہ ہے جو قانون کی پابندی کرتا ہے خواہ

وہ انسانی ہو۔ اور دوسرا وہ مستبد سامراج ہے جو کسی قاعدے و قانون کی پابندی کے لیے تیار نہیں۔ ملک میں مارشل لا نافذ تھا۔ ہم ترکی مسلمان بحری جہاز کے اندر جمع ہو کر کانفرنس کر رہے تھے اور روسی حکام غیظ و غضب سے جل بھن رہے تھے مگر ہمیں کانفرنس سے روک نہ سکتے تھے۔ اس لیے کہ ہم نے قانون کی اس تعبیر کا سہارا لے لیا تھا کہ اجتماع پر پابندی کا قانون سمندر کے اندر کسی جگہ اجتماع کرنے پر لاگو نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم نے بڑے زور شور سے کانفرنس کی اور متعدد قراردادیں منظور کیں اور پھر ہم اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے گئے اگر کمیونسٹوں کے دور میں ایسا واقعہ پیش آ جاتا تو وہ بحری جہاز کو ہی غرق کر دیتے۔

مسلمان اس حقیقت سے غافل نہ تھے وہ دونوں سامراجوں کے نقطۂ ارتکاز و اتفاق سے بخوبی واقف تھے وہ جانتے تھے کہ استعماری سامراج اشتراکیت کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آیا ہے اور دیو استبداد و ستم جمہوری اشتراکی قبا میں پائے کوب ہے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اشتراکیت کے خلاف اقدام کرنے کا پلان بنایا اور اپریل ۱۹۲۲ء میں ترکستانی مسلمانوں نے شہر سمرقند میں اپنی دوسری کانفرنس منعقد کی اور ایک قرارداد منظور کی جو ۱۹۳۲ء سے پہلے خارجی و داخلی رکاوٹوں کی وجہ سے شائع نہ ہو سکی۔ قرارداد میں اس پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا کہ 'آج کمیونسٹوں کے مظالم قیصری دور کے مظالم سے کم نہیں رہے۔ آج سوویت یونین کی سرخ فوجوں نے قریہ قریہ اور شہر شہر میں آگ لگا دی ہے۔ لوٹ مار قتل و غارتگری اور تخریب کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ آج کمیونسٹ حکومت ترکستانیوں کو ان کے قومی و ملکی حقوق دینے کو تیار نہیں۔ اس نے ان کے سیاسی و معاشی وسائل و ذرائع غصب کر رکھے ہیں۔ آزادی کے سانس لینا بھی ان کے لیے دوبھر کر دیا ہے...... اس لیے آج سے ہر مسلم اور غیر مسلم سبھی ترکستانی سوویت انقلاب کے خلاف اعلان جنگ

کرتے ہیں اور اس میں اپنا آخری قطرہ خون تک بہا دینے کا عزم رکھتے ہیں۔"

حق پسند علماء اور داعیان دین نے کمیونسٹوں کے مظالم، دہشت گردی اور استبداد کے علی الرغم اسلام پر قائم رہنے اور اسلامی شعائر کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی جانوں پر کھیل گئے اور کفر والحاد کی امڈتی ہوئی تاریکی اور طوفان تند و تیز میں اسلام کی مشعل کو روشن رکھنے کی کوشش کی۔ ملا عبدالمطلب سائبالدی، شیخ غنی، میر کریم قاضی باکو، الحاج عبدالرحیم، میرزا ملاتقی اصفہانی، ملا عبداللہ سیف الدین، موسیٰ ایوب اور سید میر جلال وغیرہم کی قربانیاں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

مفتی رضاء الدین نہایت پر جوش، مستقل مزاج اور صاحب عزیمت عالم دین تھے۔ انہوں نے لاطینی رسم الخط میں دینی لٹریچر چھاپنے کی کوشش کی مگر سوویت حکومت نے اجازت نہ دی۔ انہوں نے دستی پریس بنایا اور کتابیں چھاپ کر مسلمانوں میں خفیہ طور پر پھیلائیں۔ ان کی پراسرار وفات پر مشہور جرمن مستشرق پروفیسر بارتولڈ سپولر نے اپنے ایک مقالے میں جو ۱۲/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو "اوسٹ یوروپا" میں شائع ہوا لکھا:

> "مفتی رضاء الدین فخر الدین کی وفات سے سوویت یونین کے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ وہ بڑے روشن فکر، اسلامی رہنما، عبقری عالم، تجربہ کار سیاستداں اور مربی کبیر سے محروم ہو گئے ہیں۔"

ملحدانہ ثقافت کا جبریہ نفاذ

اسلام کا آفتاب جب سے ایشیاء ایدل اوراں، قفقاز اور روس کے زیر نگیں دوسرے علاقوں کے افق پر طلوع ہوا۔ ترک مسلمانوں کا رسم الخط عربی چلا آرہا تھا۔ اس رسم الخط میں ان کے لٹریچر کا عظیم سرمایہ تھا۔ اس کے ذریعہ وہ اپنے ماضی سے بھی وابستہ تھے اور عالمی اسلامی برادری کے ساتھ بھی ان کا تہذیبی اور ثقافتی رشتہ برقرار تھا۔ اس رسم الخط نے نہ صرف دوسری مسلمان قوموں

کے ساتھ ان کے روابط قائم رکھے بلکہ انہیں عملی وفکری وحدت عطا کرنے میں بھی زبردست کردار ادا کیا۔ پھر یہ ان کی دینی زبان کا رسم الخط تھا۔ قرآن کریم، احادیث رسول ﷺ اور دوسری دینی کتابیں اس رسم الخط میں تھیں اور اس کی بدولت دین کی گرفت ان کے قلب وذہن پر مضبوط تھی۔ کمیونسٹ اس حقیقت سے واقف تھے کہ جب تک یہ رسم الخط رائج ہے مسلمانوں کے ذہن سے عالمی اسلامی برادری کے رکن ہونے کا احساس کھرچا جاسکتا ہے نہ ان کے فکر وعمل کے رشتے اسلام اور اس کے تقاضوں سے کاٹے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۲ء میں سوویت کمیونسٹ پارٹی نے اپنے بارہویں اجلاس میں ایک قرارداد میں اس تشویش کا اظہار کیا اور پھر ۱۹۲۶ء میں مرکزی کمیونسٹ پارٹی نے تمام ترک علاقوں میں عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط رائج کرنے کی قرارداد منظور کی۔ یہ اقدام نتائج کے اعتبار سے اس قدر اہم اور دوررس تھا کہ لینن فرط مسرت سے پکار اٹھا۔ ’’یہ مشرق میں عظیم ترین انقلاب کا آغاز ہے۔‘‘

ترک مسلمانوں کی عملی وفکری بھرپور مخالفت کے باوجود لاطینی رسم الخط کے نفاذ کا سلسلہ دس سال تک جاری رہا۔ ۱۹۴۰ء میں ایک اور انقلابی قدم اٹھایا گیا۔ لاطینی رسم الخط کی بساط لپیٹ کر روسی رسم الخط کو رائج کر دیا گیا اور کہا گیا کہ لاطینی حروف ابجد نے عربی کے ساتھ جنگ لڑنے میں بلاشبہ ایجابی کردار ادا کیا مگر اب یہ واضح ہوگیا ہے کہ روسی حروف ابجد کا رواج زیادہ درست اور مضبوط ہوگا۔ لاطینی حروف صرف بورژوا طبقے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ انکی وجہ سے متعدد طباعتی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ اور روسی وغیر روسی رشتوں کا تیاپانچہ ہوگیا ہے۔ اب روسی ابجد کی بنا پر نوجوان، قومی مدارس سے روسی مدارس میں آسانی سے منتقل ہوسکیں گے۔ مزید یہ کہ لاطینی حروف ابجد کی وجہ سے مارکس، اینجلز، لینن اور اسٹالن کی عظیم تصانیف پڑھنا مشکل ہوگیا ہے۔ اس تبدیلی سے یہ تصانیف قوم کے عظیم عوام کی ملکیت بن جائیں گی۔ رسم الخط کی تبدیلی کا مقصد جریدہ سودستکایا ایٹنو گرافیا کے اس اعتراف سے ہوتا ہے:

’’رسم الخط کی تبدیلی نے ترکستان میں رسمی اسلام کے زوال میں حصہ لیا۔ اس کا اندازہ -

اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ عربی جو مسلمانوں کے مذہب اور مسجد کی زبان ہے، اس کے جاننے والوں کی تعداد ہر سال کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔"

سرکاری علماء کے بیانات

لیکن اس کے بعد نام نہاد روسی علماء و دانشور مسلمانوں کی طرف سے ایسے بیانات آتے رہتے ہیں جن سے دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید مسلمان وہاں امن وچین سے رہ رہے ہیں۔ مثلاً قازقستان کے مفتی بابا عبدالمجید خاں نے نماز جمعہ کے موقع پر حاضرین سے کہا تھا کہ "ہمارا فرض ہے کہ دعا کریں اور کوشش بھی کہ سوویت حکومت زیادہ سے زیادہ طاقتور ہو۔" مفتی صاحب نے اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ "روس ہی وہ واحد حکومت ہے جو دنیا کے اندر امن کے قیام کی کوشش کر رہی ہے۔ مغربی حکومتیں جارحیت کی سازشیں تیار کرنے میں مصروف ہیں۔"

اس طرح ماسکو کی جامع مسجد کے امام صاحب نے ایک مرتبہ پریس انٹرویو میں کہا "حکومت حسب ضرورت ہمیں مالی امداد دیتی ہے۔ ہمیں جب مسجدوں کی مرمت کی ضرورت ہوتی تو ہم حکومت کے پاس جاتے ہیں اور امداد طلب کرتے ہیں۔"

۱۹۵۳ء میں روسی حاجیوں کی جماعت جب واپس ملک پہنچی تو امیر الحج ضیاء الدین بابا خانوف نے تاس ایجنسی کے نمایندے کو بیان دیتے ہوئے کہا:

"مشرقی ممالک کے علماء کو ہم گفتگوؤں کے درمیان بتاتے رہے کہ روس میں مذہب کو پوری آزادی حاصل ہے۔"

ان بیانات اور تقریروں کا مقصد صرف باہر کی دنیا کے مسلمانوں کو خوش رکھنا اور اپنے سیاسی اغراض حاصل کرنا ہے۔ حکومت نے علماء سوء کو وظائف پر خرید لیا ہے وہ باہر کی دنیا میں مسلمانوں کی آزادی اور سوویت دیش میں عبادت و مراسم پر عدم پابندی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں لیکن خود اندرون ملک میں ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ خدا اور رسول کی توہین کی جاتی ہے۔ دین و مذہب کی

تذلیل میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بابا ضیاء الدین خانوف کی روانگی حج سے چند روز پیشتر روس کا سرکاری اخبار قرل ازبکستان ایک تند و تیز افتتاحیہ میں حکومت کو متوجہ کر چکا تھا کہ 'تاشقند کے بعض علاقوں کے باشندے ابھی تک اپنا مذہبی کاروبار جاری رکھے ہوئے ہیں۔'

حیرت اس پر ہے کہ ایک طرف دستور کی دفعہ ۱۷ کی رو سے تمام قومیتوں کو سرخ دیوتا کی جبیں سائی سے الگ رہنے کی آزادی بھی حاصل ہو چکی ہے اور دوسری طرف اس حق کا استعمال کرنے کے جرم میں وہ تعذیب و تشدد کا شکار بھی بنتی رہتی ہیں۔ کیا عدل و انصاف کا تقاضہ یہی ہے؟[۲]

حواشی وتعلیقات

۱۔ امام شامل، داغستان کے ایک ہردل عزیز قائد، نقش بندیہ سلسلہ کے پیشوا، روسی حکومت کے خلاف جہادِ آزادی کے سب سے آخری اور سب سے کامیاب رہنما۔ اپنے پیش رؤوں کی طرح وہ بھی اوار سے تعلق رکھتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے آخری سالوں میں موضع گمری (Gimri) پیدا ہوئے جہاں ان کی خاندانی جائیداد تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے ۱۸۳۰ء خون زاق کے قلعے پر ناکام حملہ کر کے شہرت حاصل کی۔ ۱۸۳۴ء میں ان کے پیش رو حمزہ بیگ کی شہادت کے بعد حریت پسندوں نے انہیں اپنا سالار منتخب کر لیا۔ ۱۸۳۷ء میں انہوں نے شکست کھائی اور مجبوراً ہتھیار ڈال دیے۔ درحقیقت یہ ایک طرح کی جنگ بندی تھی۔ ایک سال بعد انہوں نے پھر اقتدار حاصل کر کے داغستان کے ایک بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کر لی بلکہ اس کے مغرب میں Chechentzen پر بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ ان کا نظام حکومت احکام شریعت پر مبنی تھا۔ اسی لیے ان کا عہد حکومت بعد میں 'عہد شریعت' کے نام سے موسوم ہوا۔ ان کا علاقہ ۳۲ اضلاع میں منقسم تھا اور ہر ضلع میں ایک نائب (صوبے دار) اور عدالتی امور کے تصفیہ کے لیے ایک مفتی مقرر تھا۔ مفتی کے ماتحت چار قاضی ہوتے تھے جن کا تقرر خود مفتی کرتا تھا۔ شامل کی مسلح فوج ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ داغستان کا کوہستان اوران سے بھی زیادہ دشوار گزار چیچنزن کے جنگل ان کی سلطنت کی پشت و پناہ تھے۔

۲۵/اکتوبر (۶/ستمبر) ۱۸۵۹ء کو آخر کار امام شامل اپنے آخری پہاڑی قلعے گونیب (Gunib) میں ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئے۔ سینٹ پیٹرز برگ میں جب وہ زار روس الیگزنڈر ثانی کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے شہر کالوگا انکی اور ان کے عزیز واقارب کی سکونت کے لیے وقف کر دیا۔ وہیں انہوں نے خود درخواست کر کے ۱۸۶۶ء میں زار کی اطاعت اور

وفاداری کا حلف اٹھایا۔فروری ۱۸۶۹ء میں انہیں مکہ مکرمہ جانے کی اجازت مل گئی اور وہ مارچ ۱۸۷۱ء میں مدینہ منورہ میں وفات پا گئے۔ دیکھیے: اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۷۵ء، جلد ۱۱، ص ۶۰۷ - ۶۰۸

۲۔ روسی مسلمانوں کی داستان ظلم وستم کے لیے دیکھیے: آبادشاہ پوری، روس میں مسلمان قومیں، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۳ء؛ محمد رابع حسنی ندوی، سمرقند و بخارا اور اس کی بازیافت، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ ۱۹۹۸ء؛ محمد ایوب، شیخ الاسلام بخاری، بیخ کنی اسلام، ترجمہ رسالہ بیان المظالم بالشویک، جامعہ پریس دہلی، ۱۳۵۲ھ؛ محمد حامد، امام شامل، لاہور، ۱۹۴۷ء؛ اعظم ہاشمی، سمرقند و بخارا کی خونیں سرگزشت، لاہور؛ آبادشاہ پوری، ترکستان میں مسلم مزاحمت، بیروت، دی ہولی قرآن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۳ء

☆☆☆

حقوق انسانی کے تئیں امریکی رویہ

مجلسِ اقوام کی تشکیل

مغربی دنیا میں امن وامان کے قیام کے لیے مجلس اقوام کے تصور کی نشو ونما انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔ سب سے پہلے یہ تصور امریکہ میں ۱۸۱۵ء کے قریب ابھرا یہاں۔ سے انگلینڈ، فرانس اور سوئزرلینڈ تک یہ تصور منتقل ہوا۔ پہلے لندن میں ۱۸۴۳ء میں مختلف ملکوں کی کانفرنس ہوئی۔ ان کانفرنسوں کے انعقاد کے بعد انگلستان، فرانس اور امریکہ میں متعدد امن پسند تنظیمیں معرض وجود میں آئیں۔ ان تنظیموں کا مرکزی نکتہ صرف امن پسندانہ افکار کی اشاعت اور دنیا سے غلامی کا خاتمہ تھا ان تنظیموں کی سرگرمیاں جنگ کریمیا اور پیرس میں امن کانفرس ۱۸۵۷ء تا ۱۸۷۰ء تک محدود ہیں۔ آخر کار فریڈرک باسی نے اپنی انتھک کوششوں سے اس تعطل کو ختم کر دیا اور اس طرح از سر نو تحریک قیام امن کا آغاز ہوا۔ یہ تحریک اس قدر شدت سے شروع ہوئی کہ ۱۸۷۰-۷۱ء کی جنگ جرمنی وفرانس اور ۱۸۷۷-۷۸ء کی جنگ روس و ترکی بھی اس تحریک کے اثرات ختم نہ کر سکیں۔ یہ تحریک پورے یوروپ میں پھیلی۔ ہر طرف سے امن سے زندگی بسر کرنے اور غلامی کو ختم کرنے کے لیے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ ۱۸۷۰ء کے بعد دنیا کے بیشتر ممالک اس بات پر راضی ہو گئے کہ دو ملکوں کے درمیان اختلاف رونما ہونے کی صورت میں ثالثی کے ذریعہ مسئلہ کو حل کیا جائے اور اس کے لیے ایک بین الاقوامی دستور وضع کیا جائے۔

۱۸۸۹ء میں عالمی امن کانفرنس اور پارلیمانی اتحاد کانفرنس ہوئی اس کے بعد متعدد کانفرنسیں ہوئیں جن میں بین الاقوامی قانون منظور ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں ہیگ میں منعقدہ امن کانفرنس میں دنیا کی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ثالثی کی بین الاقوامی عدالت کی تشکیل کے لیے ایک عام

معاہدہ میں شریک ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتوں کے درمیان ثالثی کے معاہدوں کا تصور عام ہو گیا۔ جس کے نتیجہ میں پہلی جنگ عظیم کے بعد انجمن اقوام اور دوسری جنگ عظیم کے بعد انجمن اقوام متحدہ وجود میں آئی۔

اقوام متحدہ کا منشور پچاس ملکوں کے نمائندوں نے بین الاقوامی تنظیم سے متعلق اقوام متحدہ کی کانفرنس میں تیار کیا تھا۔ یہ کانفرنس ۱۹۴۵ء میں ۲۵/اپریل سے ۲۶/جون تک سان فرانسسکو میں ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ اقدامات ان تجاویز کی بنیاد پر کیے جو چین، روس، برطانیہ اور امریکہ کے مندوبین نے ۱۹۴۴ء میں ڈمبارٹن اوکس میں اگست سے اکتوبر تک کے عرصے میں مرتب کی تھیں۔ اقوام متحدہ کے منشور پر ۲۶ جون ۱۹۴۵ء کو دستخط کیے گئے۔ پولینڈ نے جو کانفرنس میں شریک نہیں تھا، بعد میں اس پر دستخط کیے اور اس طرح وہ بھی اکیاون اساسی ممبر ملکوں میں شامل ہو گیا۔

منشور اقوام متحدہ

باضابطہ طور پر اقوام متحدہ کا قیام ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اسی وقت عمل میں آیا جب چین، روس، فرانس، برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں نے منشور کی توثیق کر دی۔ اس کے علاوہ دیگر بہت سے ممالک نے بھی منشور پر دستخط کیے۔ اس منشور میں ان تمام لوگوں کے نظریات اور مشترکہ مقاصد کا اعلان کیا گیا ہے جن کی حکومتوں نے باہمی اشتراک سے اقوام متحدہ کی بنیاد ڈالی۔

منشور کے دیباچے میں یہ اعلانیہ موجود ہے کہ اقوام متحدہ کے اراکین اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ:

۱۔ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھیں گے۔ خود ہماری زندگی میں دو بار ایسی جنگوں کے نتیجہ میں انسانیت ناقابل بیان مصائب کا شکار ہو چکی ہے۔

۲۔ ہم انسانی حقوق کے، انسان کی عظمت اور قدر و قیمت کے، مردوں اور عورتوں کے مساوی

حقوق اور چھوٹی بڑی تمام اقوام کے برابر کے حقوق کے قائل ہیں۔

۳۔ ہم ایسے حالات پیدا کریں گے جن کے تحت حق وانصاف کا بول بالا ہو۔ معاہدوں کے تحت قبول کی جانے والی ذمہ داریوں کا احترام کیا جائے اور دیگر بین الاقوامی قوانین کے تقاضے پورے کیے جائیں۔

۴۔ ہم رواداری کے اصول پر عمل کریں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ اچھے ہمسایوں کی طرح پرامن زندگی بسر کریں گے۔

۵۔ بین الاقوامی امن اور سلامتی کی خاطر اپنی قوت کو منظّم کریں گے۔

۶۔ ہم اس بات کا خیال رکھیں گے کہ اصولوں اور طریقہ کار کو تسلیم کرتے ہوئے مشترکہ مفاد کے سوا اور کسی صورت میں مسلح طاقت استعمال نہ کی جائے اور

۷۔ تمام انسانوں کی اقتصادی اور سماجی ترقی کو فروغ دینے کے لیے بین الاقوامی مشنری کو کام میں لایا جائے گا۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ہم نے اپنی کوششوں کو متحد اور منظّم کرنے کا تہیہ کیا ہے چنانچہ ہماری حکومتوں نے اپنے ان نمائندوں کی معرفت جو شہر فرانسسکو میں جمع ہوئے ہیں اور جنہوں نے صحیح اور جائز طور پر اپنے تمام اختیارات کا مظاہرہ کیا ہے، اس بات پر رضامندی ظاہر کی ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے موجودہ منشور کو قبول کرتی ہیں اور اس کے ذریعہ ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کر رہی ہیں جو اقوام متحدہ کہلائے گا۔

منشور کے بموجب اقوام متحدہ کے قیام کا ایک اہم مقصد انسان کے بنیادی حقوق پر اپنے عقیدے کا از سر نو اقرار کرنا تھا۔ دفعہ ۵۶ میں بھی منشور نے رکن ممالک پر یہ شرط عائد کی کہ وہ انسانی حقوق اور آزادیوں کے عالمگیر احترام اور ساری دنیا میں ان پر عمل درآمد کو فروغ دینے میں اقوام متحدہ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ (منشور کی تفصیل کے لیے دیکھیے حاشیہ ۱)

حق اور ناحق کے عام اصول منضبط کرنے کے لیے جنرل اسمبلی نے اقتصادی اور معاشرتی

کونسل کو اختیار دیا کہ وہ انسانی حقوق کا ایک کمیشن مقرر کردے۔ کمیشن کو ہدایت کی گئی کہ وہ اسمبلی کی منظوری کے لیے انسانی حقوق کا ایک منشور مرتب کرے پھر ان اصولوں پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینے کی خاطر قوموں کو پابند بنانے کے لیے ایک ایسے معاہدے کی ضرورت تھی جس میں شہریوں کے بعض حقوق کی ضمانت دی گئی ہو اور جب کوئی ملک اس معاہدہ کی توثیق کردے تو گویا وہ اس بات کا عہد و پیمان کر رہا ہے کہ وہ ہر صورت میں اپنے باشندوں کے ساتھ ناانصافی اور جبر و کراہ سے پرہیز کرے گا۔

کمیشن انسانی حقوق

انسانی حقوق کا یہ کمیشن ۱۹۴۱ء میں مقرر ہوا تھا۔ اس نے کئی سال اس بحث و مباحثہ میں گزار دیے کہ منشور کے اعلیٰ اصولوں کو کس طرح الفاظ کا جامہ پہنایا جائے۔ اس نے اقوام متحدہ کے دوسرے اداروں سے بھی صلاح و مشورہ کیا آخر کار یہ منشور اسمبلی یں ۱۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کو منظور ہو گیا اس کے خلاف کسی نے رائے نہیں دی۔ چنانچہ جب ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا دستور العمل منظور ہونے والا تھا بعض ریاستوں نے اس کی توثیق سے اس وقت تک کے لیے انکار کر دیا جب تک کہ ان کو یہ یقین نہ دلایا جائے کہ اس میں حقوق کا ایک مسودہ قانون بھی شامل ہوگا۔ وہ ریاستیں اس بات کی ضمانت چاہتی تھیں کہ نئی حکومت ملکی باشندوں کو ویسی ہی ناانصافیوں کے ذریعہ زیر استبداد نہیں رکھے گی جن سے مجبور ہو کر نو آبادیات کے باشندوں نے تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دستور العمل میں حکومت کے لیے یہ بات ممنوع قرار دی گئی ہے کہ وہ دوران امن فوجیوں کو اپنے یہاں ٹھہرانے کے لیے اہل شہر کو مجبور کرے۔ کیوں کہ برطانوی فوج نے ایک ایسے ہی موقع پر نو آبادیاتی گھرانوں پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔

انسانی حقوق کے عالمی منشور میں تمام باشندوں کے لیے مندرجہ ذیل حقوق کا اعلان کیا گیا ہے:

The right to life, liberty and security of persons the right to freedom of thought, speech and communication of information and ideas; freedon of assembly and religion; the right to government through free elections; the right to free movement within the state and free exit from it; the right to asylum in another state; the right to nationality; freedom from arbitrary arrest and interference with the privacy of home and family; and the prohibition of slavery or torture.

"یعنی زندہ رہنا، آزاد رہنا، شخصی تحفظ پانا، بے قاعدہ طور پر گرفتاری سے بچے رہنا، نقل و حرکت، قیام و رہائش، تحریر و تقریر، اجتماع و عبادت اور مذہب کی آزادی اور ان تمام جائز حقوق کا حصول جن کی حفاظت کا عام طور سے جمہوریتوں کے دساتیر میں خیال رکھا جاتا ہے۔"

منشور میں معاشرتی تحفظ، تعلیم حاصل کرنے اور روزی کمانے کے موقع کے سلسلہ میں بھی انسانی حقوق کا اعلان کیا گیا:

The right to work, to protection against unemployment, and to join trade unions; the right to a standard of living adequate for health and well-being; the right to education; and the

right to rest and leisure.

جن معاشرتی واقتصادی حقوق کو ان قانونی حقوق سے مختلف قسم کا سمجھا گیا ہے ان کا ذکر عام طور سے ایک دستور العمل میں کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ نے فرق و امتیاز قائم کر کے شہری و سیاسی حقوق اور معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اگر کسی ملک کے دستور میں شہری و سیاسی حقوق کا تذکرہ ہو تو ان کو قانوناً نافذ کیا جا سکتا ہے مگر دوسری قسم کے حقوق کا معاملہ مختلف ہے۔ اب تک کسی ملک نے کوئی ایسا نظام العمل دریافت نہیں کیا ہے جس سے ہر شہری کو صحت مند ماحول میں مکمل روزگار فراہم ہو سکے نہ کوئی ملک سب کی ضروریات کے مطابق تعلیم اور صحت کا انتظام کر سکا ہے۔

اس کے بعد اسمبلی نے انسانی حقوق کے کمیشن کو ایک ایسے معاہدے کا مسودہ تیار کرنے کی ہدایت کی جسے ایک عہد نامے کی صورت میں توثیق کرانے کے لیے ممبر ملکوں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ کچھ بحث و تمحیص کے بعد کمیشن نے دو ایسے معاہدوں کے مسودے پیش کرنے کی سفارش کی جن میں ایک قانونی اور سیاسی حقوق سے اور دوسرا اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق سے متعلق ہو کیوں کہ جہاں تک قانون و دستور کا تعلق ہے، حقوق کی یہ دونوں قسمیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ منشور کے متن کو الگ الگ دو معاہدوں کی صورت میں تقسیم کر دینے کا مشورہ ۱۹۵۱ء میں اسمبلی کے چھٹے اجلاس نے قبول کر لیا۔

پہلے معاہدے کی توثیق کرنے والا ایسا قانون بنانے اور اسے نافذ کرنے کا پابند ہو گا جو اس ملک کے باشندوں کو غیر منصفانہ اور ظالمانہ برتاؤ سے بچا سکے۔ دوسرے معاہدے کی توثیق کرانے والا ملک اپنے اس فرض کو تسلیم کرے گا کہ اپنی بساط کے مطابق بہتر حالات زندگی کو فروغ دینا ضروری ہے اس فرض کے سلسلہ میں بعض ایسے حقوق کو بھی تسلیم کرے گا جو اقتصادی و معاشرتی تحفظ سے متعلق ہوں مثلاً ٹریڈ یونین میں شرکت کا حق دوسری قسم کے معاہدے کے ضمن میں ہے کیوں کہ اس ضروری اقتصادی حق سے فلاح عامہ کو فروغ نصیب ہو سکتا ہے۔[۲]

بہت سے جمہوری ملک کے دساتیر میں چند ایسے حقوق کی ضمانت دی گئی ہے جو اقوام متحدہ کے ان معاہدوں میں شامل ہیں یہ تاریخی اعتبار سے یا مقامی اہمیت کے حامل حقوق ہیں چنانچہ مندوبین کی اکثریت نے ان کو اس قدر ضروری تصور نہیں کیا کہ اصولوں کے ایک عالمی منشور میں ان کو شامل کیا جاتا۔ لہٰذا معاہدوں کے متن میں یہ شرط رکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ان کی توثیق ایسے حقوق کو کالعدم نہیں کرے گی جو پہلے سے توثیق کنندہ ملک میں رائج ہوں۔ نیچے انسانی حقوق کے مختلف معاہدوں کی قانونی و سیاسی اہمیت کا ایک جدول پیش کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان معاہدات میں امریکہ کی شرکت مایوس کن رہی ہے۔ امریکی سیاست دانوں کی یہ توجیہ کہ بین الاقوامی انسانی حقوق کمیشن کی تجاویز سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا دستور ہے، عذر لنگ کے سوا کچھ نہیں تاہم صدر جمی کارٹر نے ۱۷ر مارچ ۱۹۷۷ء کی ایک تقریر میں اقوام متحدہ کو یقین دلایا تھا کہ چار معاہدوں میں ان کا ملک شریک رہے گا۔

Status of Human Rights Covenants

	Year Adopted by U.N. General Assembly	U.S. Ratification Status	U.S.S.R. Status	Total number of States Ratified	
Convention on the prevention and Punishment of the Crime of Genocide	1948	No	Yes	81	In force (1951)
Convention of Political Rights of Women	1952	Yes	Yes	79	In force (1954)
Convention on Economic, Social and Cultural Rights	1966	No	Yes	37	In Force (1976)

Optional Protocal to the International Covenant on Civil and Political Rights.	1966	No	No	13	In force (1976)
Convention on the Non-Applicability of Statutory Limitations to War Crimes and Crimes against Humanity	1968	No	Yes	21	In force)1970)
Convention on the Suppression and Punishment of the Crime of Apartheid	1973	No	Yes	21	In force (1976)

ایک خاص ضابطہ قانون کا موضوع نسل کشی ہے جسے جنرل اسمبلی نے ۹ دسمبر ۱۹۴۸ء کو منظور کر کے رکن ملکوں کے پاس برائے توثیق بھیج دیا تھا توثیق کرنے والے ملک اس بات پر متفق ہوئے کہ قومی، نسلی یا مذہبی وانسانی اعتبار سے کسی جماعت کو بالکل تباہ کر دینے کی کوشش نسل کشی کے جرم میں شامل ہے۔ کسی جماعت کے فرد کو محض اس لیے مار ڈالنا کہ وہ اس کا رکن ہے۔ اس کو جسمانی یا ذہنی اعتبار سے سخت اذیت دینا، کسی جماعت کو اس کے افراد میں پیدائش اطفال کا سلسلہ روک کر ختم کر دینا یا اس کے بچوں کو کسی اور جماعت میں داخل کر دینا یہ سب حرکتیں نسل کشی میں داخل ہیں۔ اس قانون کی توثیق کرنے والی حکومتیں وعدہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے ملک کے ہر اس باشندہ کو جو نسل کشی کا ارتکاب کرے ضرور سزا دیں گی۔

اقتصادی اور معاشرتی کونسل نے حقوق نسواں سے متعلق ایک کمیشن جون ۱۹۴۶ء میں قائم کیا تھا۔ یہ کمیشن عورتوں کے سیاسی اور قانونی حقوق اور ایسے امور سے تعلق رکھتا ہے جن کا تعلق تعلیم اور روزگار میں مساویانہ حقوق سے ہے۔

اسمبلی نے ۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء کو عورتوں کے سیاسی حقوق سے متعلق ضابطہ قانون توثیق کے لیے رکن حکومتوں کے پاس بھیج دیا اس ضابطے کو ماننے والے ملک بلا فرق و امتیاز عورتوں کے لیے

سیاسی رائے دینے، سرکاری عہدہ سنبھالنے اور سرکاری اداروں اور عدالتوں میں خدمات انجام دینے کے حقوق کو تسلیم کرلیں گی۔ بعض ملکوں نے قانونی طور پر عورتوں کے ان حقوق کو تسلیم نہیں کیا ہے لہذا ضابطہ میں شامل ہونے سے قبل ان حکومتوں کو اپنے قوانین میں تبدیلی کرنی ہوگی۔

حقوق انسانی سے کھلواڑ

حقوق انسانی کی اس جدوجہد اور شاندار دستاویزی تاریخ کے باوجود اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ ساری تگ و تاز اور تحریر و تسجیل کی تنظیم مغربی اقوام و مفادات کے تابع ہے۔ آسٹریلیا اور امریکہ میں لاکھوں افریقی باشندوں کی غلامی اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو سے کھلواڑ تاریخ کی ایک چشم کشا حقیقت ہے۔ آج نو آبادیاتی نظام فکر و عمل رخصت ہو چکا ہے مگر غیر مغربی دنیا کے عوام پر مغربی گرفت اور غلبہ و تسلط کی جو راہیں نکالی گئی ہیں وہ مہذب و متمدن مگر زیادہ تباہ کن اور ہلاکت خیز ہیں ایک طرف استعماری اشرافیہ کی جگہ سودیشی اشرافیہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے جو زیادہ آمرانہ و استبدادی ہے اور عوام پر استیلاء و تغلب کے ذریعہ مغربی حلیفوں کے کاز اور مفاد کی تکمیل کررہا ہے تو دوسری طرف مغرب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ذریعہ عالمی سیاست کی نکیل اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ مغربی طاقتیں چشم و ابرو کے اشاروں پر حقوق انسانی کے دستاویزی کھلونوں کی موجودگی میں لاکھوں افراد کی زندگی تباہ و برباد کردیتی ہیں۔ حکمراں مغرب نے انٹرنیشنل مانٹری فنڈ، ورلڈ بینک، گیٹ اور جی ۷ کے ذریعہ عالمی معیشت کی نبض پر اپنی گرفت مضبوط کررکھی ہے۔ عالمی اخبار و اطلاعات اور ذرائع ترسیل پر بھی اسی کا قبضہ رہتا ہے اور موسیقی، سنیما اور فیشن شو کے ذریعہ عوام کی طرز معاشرت و بود و باش پر حاوی ہے۔

حقوق انسانی کی تمام تر یقین دہانیوں کے باوجود مغرب نے غیر مغربی دنیا میں بدترین قسم کی آمریت اور استبداد کو گوارا کررکھا ہے۔ آج مغرب کا عالمی نظام دور استعمار کے مظالم سے کہیں زیادہ قہر و جبر کا باعث و محرک ہے۔ نئے عالمی نظام کے جمہوریت پسند حکمراں اور رہنما ہمیں باور

کرا چکے ہیں کہ جب تک ان کے مفادات خطرہ میں نہیں پڑتے، اس وقت تک جمہوریت اور بنیادی حقوق کے مسائل کو نہیں اٹھائیں گے۔ حالانکہ ان طاقتوں کا اعلان ہے کہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے نام پر وہ کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر سکتی ہیں۔ حقوق انسانی کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے امن عالم اور جمہوریت و شراکت کے افکار کا سراغ شاعروں اور ادیبوں کے یہاں بھی لگایا ہے۔ مفکرین اور فلاسفہ کے یہاں بھی ان تخیلات کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں مثال کے طور پر اطالوی شاعر دانتے (تیرہویں صدی) ولیم پین (سترہویں صدی) سینٹ پیرے، جان جاک روسو، کانٹ اور جیرمی بینتھم، سینٹ سائمن، ولیم لیڈ، ولیم جے، مولیناری، بلنچلی، لورمر اور والٹیر جیسے ادباء اور اہل فکر عالمی امن اور حقوق انسانی کے احترام کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں مگر تاریخ مغرب کی اس دلچسپ اور عبرتناک حقیقت سے کون صرف نظر کر سکتا ہے کہ جمہوریت و حقوق انسانی کے یہ سارے بلند آہنگ نعرے اور تخیلات مغربی اقوام ہی کے لیے خاص تھے آزادی و حریت کے ان تمام کلمات و دستاویزات کے اصل مخاطب مغربی علوم وادارے تھے اور ادباء، شعراء اور مفکرین و سیاست داں سب غیر مغربی اقوام کو آزادی دینے اور حقوق انسانی کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع دینے کے روادار نہ تھے۔ وہ فرانسیسی، انگریز اور اطالوی افراد اور مغربی ممالک کے باشندوں کو ہی انسان سمجھتے تھے چنانچہ والٹیر (۱۷۷۸-۱۶۹۴ء) جسے یوروپی رواداری و مفاہمت کا نقیب سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں معروف ہے کہ اس نے اپنی موت سے قبل کیتھرین ملکہ کو خط لکھا تھا کہ اسے اپنی زندگی میں ایک کام نہ کر سکنے کا افسوس ہے وہ یہ کہ وہ کسی مسلمان کا گلا ذاتی طور پر نہ گھونٹ سکا اور وہ یہ حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔

امریکہ جو حقوق انسانی کا تحفظ اور نقیب بنتا ہے اور جمہوری قدروں اور بنیادی حقوق کے تحفظ کی خاطر عراق پر بمباری کر کے معصوم شہریوں کے خون سے ہولی کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتا خود اپنے ملک میں غیر امریکی باشندوں اور مسلمانوں کے ساتھ قانون کا سہارا لے کر

ناانصافی اور ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے جس کی نمایاں مثال اوکلاہوما میں بم حادثہ اور اس کے مابعد کی ظالمانہ کارروائیاں ہیں۔

اوکلاہوما بم حادثہ اور اس کے اثرات

۱۹/اپریل ۱۹۹۵ء کو امریکہ جیسا متمدن وترقی یافتہ ملک اپنے مسلمان شہریوں کے لیے دارالعذاب بن گیا۔ ۴ لاکھ پچاس ہزار کی آبادی والے شہر اوکلاہوما میں ایک نو منزلہ عمارت میں بم سے لدی ہوئی ایک کار برسٹ ہوگئی۔ ۶۰۰ سے زائد افراد اس بم حادثہ کا شکار ہوئے۔ ۱۲۰ افراد جن میں ۱۲ بچے بھی شامل تھے جائے وقوع پر جاں بحق ہوگئے۔ مسلمانوں کا اس حادثہ سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا اور کسی معنی میں بھی وہ اس دہشت گردی کے لیے ذمہ دار قرار نہیں دیے جاسکتے تھے مگر حادثہ کے فوراً بعد ذرائع ابلاغ نے بغیر کسی تحقیق کے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار قرار دینا شروع کردیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبروں نے مسلمانوں کو دہشت گرد اور بنیاد پرست بنا کر اس طرح پروجیکٹ کیا کہ وہی اس حادثہ کے خالق اور منتظم تھے۔ اخبارات نے انہیں ''قاتل اطفال'' کے روپ میں پیش کیا فون پر مسلمانوں کو دھمکیاں موصول ہوئیں۔ قومی اخبارات نے سرخیاں لگائیں:

''یہ تیسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہے۔ ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ ہم آرہے ہیں۔''

"This is world war III and we are ready and we are coming!"

''ہمیں تمام مسلمانوں کو امریکہ سے نکال دینا چاہیے۔''

"We should expell all the Muslims!"

''امریکہ کو مشرقِ وسطیٰ کو سبق سکھانا چاہیے جہاں سے یہ دہشت گرد آتے ہیں۔''

"The U.S. should make out the middle East

from where these terrorists com!"

''کلنٹن کو اب کس چیز کا انتظار ہے۔''

"What is Clinton waiting for?"

''مجرموں کو کوئی سزا نہیں ملے گی؟''

"There will be no retribution."

مسلمانوں پر حملے

کیلی فورنیا سے لے کر نیویارک تک شاہراہوں پر گلیوں میں، اسکولوں میں اور دفاتر میں ہر جگہ خوف و دہشت اور سراسیمگی پھیل گئی۔ مسلمانوں پر حملے کیے گے۔ نارمن کے ایک اسپتال میں ایک مسلمان خاتون کو زدوکوب کیا گیا اور اس کا حمل ضائع ہو گیا۔ شہر کی جامع مسجد کے امام جمال عبدالرحیم نے بیان دیا کہ ہم لوگ بہتر گھنٹوں تک اپنے گھروں میں نظر بند رہے مبادا کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہو جائے۔ قریب کے ایک ٹیلی ویژن اسٹیشن نے وقوع حادثہ کے چند لمحات کے بعد ہی سے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کا آغاز کر دیا امام جامع مسجد نے مقامی میڈیا سے ربط قائم کرنا چاہا مگر سخت ناکامی ہوئی اس دوران ان افواہیں گشت کرتی رہیں اور مسلمان بدنام ہوتے رہے مسلمان رہنماؤں نے اس بے بنیاد احتجاجی مہم کو روکنے کی جدوجہد کی یہاں تک کہ امریکن مسلم کونسل نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس خطرناک سازش کے حصہ داروں کے متعلق اطلاع فراہم کرنے والے کو پچاس ہزار امریکی ڈالر انعام دیئے جائیں گے۔ ۱۲ مسلم تنظیموں نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا اور اخبارات سے اپیل کہ کہ جب تک حقائق سامنے نہ آجائیں غیر ذمہ دارانہ بیانات سے مسلمانوں کو بدنام نہ کیا جائے مگر اسرائیلی ایجنٹوں کے ایک گروپ نے جو دہشت گردی کے ماہر محقق تصور کیے جاتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف مہم میں ہراول دستہ کا کام کر رہے تھے، ایک نہ سنی۔ وہ بڑی مستعدی اور عیاری سے اسلام کے خلاف سازش کے جال بنتا

رہا۔ اس گروپ کا ایک نمایاں فرد یوسف بوڈالسکی ہے جو سابق اسرائیلی ایجنٹ ہے اور اب انسداد دہشت گردی انجمن کا ڈائرکٹر ہے یہ اسی کی شورش ہے کہ بیرونی ملک کے مسلمانوں کے ایک گروہ نے اس حادثہ کو منظم کیا تھا۔ اس نے Target Americans کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امریکہ کا براہ راست تصادم مسلمانوں سے ہے کیوں کہ انہوں نے امریکہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا ہے:

"They have declared a holy war against America."

اسی طرح ایک دوسرے اسرائیلی مبصر اسٹیون ایمرسن نے بھی بم حادثہ کی خبر سنتے ہی مسلمانوں کی جانب اسے منسوب کر دیا بعد میں IBF کی تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ یہ سارا پروپیگنڈہ بے بنیاد تھا اور ۲۷ سالہ ایک امریکی دہشت گرد Timo James thy Mc Veigh کے ۴۸ گھنٹوں کے بعد ہی گرفتار ہو گیا جو اس المناک حادثہ کے ذمہ داروں میں شامل تھا۔

البتہ اس پورے سیاہ ترین عرصے میں کہیں کہیں سے حق وصداقت کی صدا بھی بلند ہوئی۔ مشہور ناول نگار Tom Clancy نے لاس اینجلز ٹائمز کے ۲۱ اپریل ۱۹۹۵ء میں اس واقعہ کی مذمت کی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس الزام تراشی کی پرزور تردید کی اس نے کہا اسلام رحم ومحبت کے خدا پر یقین وایمان کا مبلغ ہے اسے دہشت گردی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اس حادثہ کے بعد کلنٹن حکومت نے مستقبل میں اس طرح کے حادثات کی پیش بندی کے لیے ایک نیا ایکٹ منظور کیا جو Counter Terrorism Act - 95 کے نام سے معروف ہے۔ اس قانون میں اشتعال انگیزی، بم بنانے اس کا کاروبار کرنے اور نیوکلیر مواد استعمال کرنے سے متعلق تمام جزئیات وتفصیلات ہیں اور انتقال مکانی اور چندہ جمع کرنے سے متعلق امور کو بھی اس میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس قانون کے مطابق حکومت دس سال تک قید کی سزا دے سکتی ہے اگر حکومت کسی تنظیم کو دہشت گرد قرار دے دے تو اس کے جائز اور قانونی کاموں میں بھی

کسی کی دلچسپی اور اعانت قابل تعزیر جرم قرار پائے گی۔ اس قانون کی یہ صراحت بھی ہے کہ اگر صدر مملکت کسی تنظیم کو امریکہ کے لیے مضرت رساں سمجھتا ہے اور اسے دہشت گرد قرار دیتا ہے تو اس تنظیم کے نمائندے قابل جلاوطنی قرار پائیں گے۔ ملک بدر کرنے کا یہ حکم اسٹیٹ سکریٹری یا اٹارنی جنرل بھی صادر کر سکتا ہے اور اس طرح کے حکم ناموں کے خلاف کسی عدالت میں اپیل نہیں کی جا سکتی۔

اس ایکٹ کی رو سے صدر کے ذریعہ اعلان کردہ کسی بھی دہشت گرد تنظیم کو کوئی مالی امداد نہیں دی جا سکتی۔ جب کہ ۱۹۹۴ء کے کرائم بل کے ذریعہ دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں مالی اعانت کرنا پہلے سے ممنوع اور قابل تعزیر ہے اب اس نئے ایکٹ کے ذریعہ اس تنظیم کے رفاہی و فلاحی کاموں میں بھی تعاون نہیں کیا جا سکتا جسے صدر نے دہشت گرد قرار دے دیا ہو۔ اس طرح حقوق انسانی کے علمبردار اس ملک میں اگر حکومت چاہے گی تو کشمیر، فلسطین، افغانستان، بوسنیا اور چیچنیا وغیرہ کے مظلوم اور ستم رسیدہ بچوں اور خواتین کی امداد بھی قابل تعزیر جرم قرار پائے گی اور یہی دراصل مقصد ہے اس جدید قانون سازی کا یہودی لابی امریکی مسلمانوں کی فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کی ٹوٹی پھوٹی امداد کا سلسلہ بند کرنا چاہتی تھی۔ یہودی کالم نگار اسٹیون ایمرسن نے وال اسٹریٹ جرنل کے ۸ مارچ ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں ایک مضمون لکھا تھا جس کی سرخی تھی۔

"The Snake of Terror in our Garden."

''ہمارے نخلستان میں دہشت گردی کا سانپ۔''

اس مضمون میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان تنظیموں نے امریکہ میں بسیرا کر لیا ہے وہاں وہ فنڈ جمع کرتی ہیں اور مجاہدین کو تربیت دیتی ہیں اس نے تجویز کیا تھا کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے امریکہ میں ایسے مسلمانوں کے داخلہ پر پابندی لگ سکے اور غیر امریکی باشندوں کو وہاں سے نکالا جا سکے۔ چنانچہ اوکلاہوما بم حادثہ کے بعد ہی Rabbi Meher May نے لاس اینجلز میں Simon Wiesemthal Center کو یہ مشورہ دیا تھا

کہ ان تنظیموں کی مالی امداد کو خلاف قانون قرار دے دیا جائے۔ یہ سب کچھ اس ملک میں ہوا جو قانون کی نگاہ میں تمام انسانوں کی برابری کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوکلاہوما حادثہ کی تحقیقات ہوگئیں اور مسلمانوں کی بے گناہی ثابت ہوگئی اور اصل مجرموں کی نشاندہی ہوگئی تو اس شہر کی جامع مسجد کے امام سے سوال کیا گیا کہ اب جب کہ ذرائع ابلاغ کی منافرتی مہم بے بنیاد ثابت ہوگئی اور مسلمان بری الذمہ قرار پا گئے تو کیا انہیں اطمینان ہوگیا ہے؟ حقوق انسانی کے چمپین اس ملک کے ایک شہر کے امام کا جواب تھا:

No it is foolish for the Muslims to relax in America!.

''نہیں امریکہ جیسے ملک میں مسلمانوں کا مطمئن ہو جانا بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔''[۳]

حواشی وتعلیقات

۱۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو انسانی حقوق سے متعلق عالمی منشور کا اعلان کیا تھا۔اس میں تیس دفعات ہیں مختصر تمہید کے بعد دفعات کا تذکرہ یوں ہے:

۱۔ تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں، امتیازات وحقوق کے معاملہ میں مساوی الحیثیت میں انہیں عقل اور ضمیر بخشا گیا ہے

۲۔ ہر فرد ان تمام حقوق اور آزادیوں کا مستحق ہے جن کی صراحت اس منشور میں کی گئی ہے اس معاملہ میں نسل، رنگ ، جنس، زبان ، مذہب سیاسی یا دوسرے نظریات ،قومی وسماجی حیثیت ، املاک، پیدائش یا کوئی اور حیثیت وجہ امتیاز نہیں بن سکتی علاوہ ازیں اس ملک یا خطہ کی سیاسی حیثیت کی بنا پر کوئی فرق روا نہیں ہوگا

۳۔ ہر فرد کا اپنی زندگی اور آزادی کی سلامتی کا حق ہے

۴۔ کسی بھی فرد کو غلامی یا جبری خدمت کے لیے نہیں رکھا جائے گا۔ غلامی اور غلاموں کی تجارت اپنی تمام شکلوں میں ممنوع ہوگی

۵۔ کسی بھی فرد کو تشدد، ایذا رسانی کا ہدف نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی کسی کو تذلیل آمیز برتاؤ یا سزا سے دو چار کیا جائے گا

۶۔ ہر فرد کو قانون کی نظر میں بحیثیت فرد ایک تسلیم شدہ حیثیت حاصل ہوگی

۷۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ کسی امتیاز کے بغیر فرد کو یکساں قانونی تحفظ حاصل ہوگا

۸۔ ہر فرد کو ان بنیادی حقوق کی بے حرمتی اور پامالی پر با اختیار قومی عدالتوں سے کارگر چارہ جوئی کا حق ہوگا جو اسے آئین یا قانون نے عطا کیے ہیں

۹۔ کسی فرد کو بلا جواز گرفتاری، نظر بندی یا جلاوطنی کی سزا نہیں دی جائے گی

۱۰۔ ہر فرد کو اپنے بنیادی حقوق و فرائض کے تعین یا اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کی برأت کے لیے آزاد، خودمختار اور غیر جانبدار ٹریبونل میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا یکساں حق حاصل ہوگا

۱۱۔ (ا) کسی تعزیری جرم کی صورت میں ہر فرد کو اس وقت تک بے قصور سمجھے جانے کا حق حاصل ہوگا جب تک ایسی کھلی عدالت میں اسے قانون کے مطابق مجرم ثابت نہ کر دیا جائے جہاں اسے اپنی صفائی کی تمام ضمانتیں فراہم کی گئی ہوں

(ب) کسی فرد کو کسی ایسے ارادی یا غیر ارادی فعل کی بنا پر قابل تعزیر جرم کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا جو فی الواقع قومی یا بین الاقوامی قانون کے تحت قابل تعزیر نہ ہو۔ اس کے علاوہ سزا اس سے زیادہ سخت نہیں دی جائے گی جتنی کہ اس وقت نافذ العمل تھی جب وہ قابل سزا جرم کیا گیا تھا

۱۲۔ کسی بھی فرد کی خلوت، خاندانی امور، خانگی زندگی یا خط و کتابت میں دخل اندازی ممنوع ہوگی نہ ہی کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے گا ایسی مداخلت یا حملے کے خلاف ہر شخص کو قانونی تحفظ کا حق حاصل ہوگا

۱۳۔ (ا) ہر فرد کو اپنی ریاست کی سرحدوں میں آزادانہ نقل و حرکت اور رہائش کی مکمل آزادی ہوگی

(ب) ہر فرد کو بیرون ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے کا حق ہوگا

۱۴۔ (ا) ہر فرد کو ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے دوسرے ملک میں پناہ لینے اور اس پناہ سے فیض یاب ہونے کا حق ہے۔

(ب) غیر سیاسی جرائم یا اقوام متحدہ کے مسلمہ اصول و مقاصد کے برخلاف سرگرمیوں کے سلسلہ میں درج مقدمات سے بچنے کے لیے حق قابل استعمال نہ ہوگا

۱۵۔ (ا) ہر فرد کو شہریت حاصل کرنے کا حق ہوگا

(ب) من مانے ڈھنگ سے بغیر کسی جواز کے اس کو شہریت سے محروم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی شہریت بدلنے کا حق سلب کیا جائے گا

۱۶۔ (ا) ہر بالغ مرد و عورت کو بلا امتیاز نسل، شہریت یا مذہب، شادی کرنے اور خاندان کی بنیاد

ڈالنے کا حق ہے شادی کے لیے، شادی کے دوران اور شادی کا رشتہ ختم کرنے کے معاملہ میں دونوں برابر کے حقوق کے مالک ہیں۔

(ب) شادی زن وشوہر کی مکمل آزادانہ مرضی اور منظوری سے ہوگی

(ج) خاندان، سماج کا بنیادی اور جزلاینفک یونٹ ہے جو ریاست اور سماج کی طرف سے مکمل تحفظ کا مستحق ہے

۱۷۔(ا) ہر فرد تنہا یا دوسروں سے مل کر جائداد رکھ سکتا ہے

(ب) کسی کو بلا جواز اس کی ملکیت سے محروم نہیں کیا جائے گا

۱۸۔ ہر فرد کو فکر وخیال، مذہب وعقیدہ کی آزادی ہے۔اس حق میں اپنا مذہب یا عقیدہ بدلنے کی آزادی شامل ہے علاوہ ازیں انفرادی یا اجتماعی طور پر علیحدگی میں یا برسرعام تبلیغ عقیدہ، اظہار عقیدہ اور عبادت کا حق ہے

۱۹۔ ہر فرد کا اظہار رائے کرنے کا حق ہے اس میں کسی مداخلت کے بغیر کوئی بھی رائے قائم کرنے کسی بھی ذریعہ سے سرحدوں کی پروا کیے بغیر اطلاعات کا حصول اور انہیں دوسرے مقامات تک پہنچانے کا حق ہے

۲۰۔(ا) ہر فرد کو پرامن اجتماع وتنظیم اور کسی بھی جماعت سے وابستگی کا حق ہے

(ب) کسی کو کسی خاص جماعت سے وابستگی رکھنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا

۲۱۔ ہر فرد کو براہ راست یا آزادی سے منتخب نمائندوں کے ذریعہ اپنے ملک کی حکومت میں شرکت کا حق ہے

(ب) ہر فرد کو اپنے ملک کی سرکاری ملازمت کے حصول کا مساویانہ حق حاصل ہے

(ج) حکومت کے اقتدار کی بنیاد عوام کی خواہش ومرضی ہوگی۔اس کا اظہار وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے آزادانہ انتخابات کے ذریعہ ہوگا۔یہ انتخابات ہمہ گیر اور برابری کے حق رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے

۲۲۔ ہر فرد کو معاشرے کے رکن کی حیثیت سے سماجی تحفظ کا حق ہوگا۔ باوقار زندگی اور شخصیت کی تعمیر کے لیے قومی کوششوں اور بین الاقوامی تعاون کے ذریعہ اور ہر ریاست کے وسائل کے مطابق اسے معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق حاصل ہوں گے

۲۳۔(۱) ہر فرد کو روزگار، اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرنے بہتر اور منصفانہ شرائط پر کام حاصل کرنے اور بیروزگاری سے تحفظ کا حق ہوگا

(۲) ہر فرد بلا امتیاز یکساں کام کی یکساں اجرت پائے گا

(۳) ہر کام کرنے والے فرد کو بہتر اور منصفانہ معاوضہ پانے کا حق ہے جو اسے، اس کے خاندان کے لیے باعزت اور شایان شان زندگی گزارنے کی ضمانت دے سکے اور اگر ضروری محسوس ہو، تو سماجی تحفظ کے دوسرے ذرائع بھی اس معاوضہ کے ساتھ منسلک ہوں

(۴) ہر فرد کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ٹریڈ یونین بنانے اور ان میں شامل ہونے کا حق ہے

۲۴۔ ہر فرد کو راحت و آرام، تفریح، اوقات کار کی مناسب حد بندی، وقفہ وقفہ سے تنخواہ کے ساتھ چھٹیاں ملنے کا حق ہوگا

۲۵۔ ہر فرد کو اپنی اور اپنے اہل خاندان کی صحت و تندرستی اور خوشحالی کے لیے معقول معیار زندگی برقرار رکھنے کا حق ہے اس میں خوراک، لباس، رہائش، طبی سہولیات، ضروری سماجی خدمات، بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے روزگار سے محرومی کی صورت میں تحفظات شامل ہیں

(۲) زچگی و شیر خوارگی کو خصوصی توجہ و امداد کا مستحق سمجھا جائے گا اور تمام بچوں کو خواہ وہ شادی کے بعد پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بغیر یکساں سماجی تحفظ ہوگا

۲۶۔(۱) ہر فرد کو تعلیم کا حق ہے، تعلیم کم از کم ابتدائی اور بنیادی مرحلوں پر مفت ہوگی، ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی جب کہ ٹیکنیکل اور پیشہ وارانہ تعلیم کا اہتمام عام کیا جائے گا، اعلیٰ تعلیم اہلیت کی بنیاد پر سب کے لیے یکساں طور پر قابل حصول ہوگی

(۲) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کا ارتقاء ہوگا، تاکہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے لیے احترام کا جذبہ مستحکم ہو۔ تعلیم تمام قوموں میں، نسلی و مذہبی اکائیوں میں، باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو فروغ دے گی نیز اقوام متحدہ کی ان سرگرمیوں کے لیے معاون ہوگی جو امن برقرار رکھنے کے لیے کی جارہی ہیں

(۳) والدین کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے نوعیت تعلیم کا انتخاب کرسکیں

۲۷۔(۱) ہر فرد کو ملک و قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، علوم وفنون سے استفادہ کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے، سائنسی ترقیوں سے متمتع ہونے اور اس کی برکتوں سے فیضیاب ہونے کا حق ہے

(۲) ہر فرد کو اپنی سائنسی، ادبی فنی تخلیقات سے منسلک اخلاقی و مادی مفادات کے تحفظ کا حق ہے

۲۸۔ ہر فرد ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام میں زندگی گزارنے کا مستحق ہے جس میں وہ حقوق اور آزادیاں عملاً حاصل ہوں جن کا تذکرہ منشور ہذا میں کیا گیا ہے

۲۹۔(۱) ہر فرد پر اپنے معاشرہ کے تئیں بھی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جس میں رہ کر ہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور بھرپور تعمیر ممکن ہے

(۲) اپنے حقوق اور آزادیوں کے سلسلہ میں ہر فرد قانون کی عائد کردہ صرف ان پابندیوں کا تابع ہوگا جن کا مقصد دوسروں کے حقوق و آزادی کا تحفظ اور ان کے احترام کو یقینی بنانا ہے

(۳) ان حقوق اور آزادیوں کو کسی بھی صورت میں اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے منافی استعمال نہیں کیا جاسکتا

۳۰۔ اس منشور کے کسی بھی حصہ کی ایسی تعبیر نہیں کی جائے گی جس کا مقصد کسی بھی ریاست یا فرد کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے کا حق دلانا ہو جس کا منشا اس منشور میں مذکور آزادیوں اور حقوق کا خاتمہ کرنا ہو

اس منشور میں جن حقوق اور آزادیوں کا تذکرہ ہے انہیں بعد میں دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔

ایک فہرست میں معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کو یکجا کر دیا گیا اور اسے معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کا بین الاقوامی میثاق کہا گیا جبکہ دوسرے کو شہری اور سیاسی حقوق کا بین الاقوامی میثاق قرار دیا گیا۔ جنرل اسمبلی نے ۱۹۶۶ء میں ان دو عہد ناموں (Cavenants) کو منظوری دی۔ اقوام متحدہ کے رکن ممالک کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق رضا کارانہ طور پر ان حقوق کو تسلیم کرتے ہوں تو ان عہد ناموں پر دستخط کر دیں۔ ہندوستان دستخط کرنے والے ملکوں کی فہرست میں شامل ہے

۲۔ اقوام متحدہ کے منشور سے ہٹ کر بھی حقوق انسانی سے وابستگی اور اس کی ضمانت کا اظہار ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ۷۵-۱۹۷۳ء میں ہلسنکی میں یوروپ میں تحفظ اور تعاون کے موضوع پر کانفرنس ہوئی جس نے Helsinki Final Act کا مسودہ منظور کیا۔ بنیادی آزادیوں اور انسانی حقوق کے تحفظ کا یوروپی کنونشن ۱۹۵۰ء میں پہلی بار منعقد ہوا اور اس نے International Covenant on Civil and Political Rights کا اعلامیہ منظور کیا اور European Social Charter کو باقاعدہ منظوری دی۔ ۱۹۴۸ء میں نویں پان امریکن کانفرنس نے جو مسودہ پاس کیا وہ American Declaration on the Rights and Duties of Man کا نام سے ریکارڈ ہوا۔ ۱۹۸۱ء میں آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی نے African Charter on Human and People's Rights کو منظوری دی۔ اس کے علاوہ متعدد ایسے اعلامیے ہیں جو حقوق انسانی کے تحفظ کی وکالت کرتے ہیں۔

۳۔ نائن الیون کے عالمی شہرت یافتہ حادثہ کے بعد امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر جو عالمی دہشت گردی قائم کی۔ افغانستان اور عراق کو جس طرح تباہ و برباد کیا اور مسلمانوں کے خلاف عالمی مہم چھیڑی اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر خورشید احمد، امریکہ-مسلم دنیا کی بے اطمینانی - ۱۱ر ستمبر سے پہلے اور بعد' منشورات، لاہور، ۲۰۰۲ء اور ۷ر جولائی ۲۰۰۵ء لندن بم دھماکوں کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی تازہ مہم اور اس پر اسلامی تنقید کے لیے

دیکھیے راقم کی انگریزی کتاب جو اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہے: Terrorism, Resistance and Islam- A Study of 7/7 London Bombings، سیریلز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

☆☆☆

اشاریہ

ب

پ

ی

☆☆☆

أساس اللغة العربية

(تین جلدوں میں)

عربی زبان سکھانے کی جدید طرز کی کتاب

اول: -/90 دوم: -/60 سوم: -/120

اس کتاب کی تالیف میں جدید مناہج تدریس کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لیے یہ کتاب غیر عربی داں حضرات کے لیے کم وقت میں زیادہ مفید اور دوررس اثرات کی حامل بن گئی ہے۔

اس کتاب کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں راست اسلوب (Direct Method) کو ملحوظ اور پیش نظر رکھا گیا ہے، جن لوگوں کو غیر مادری زبان کے درس وتدریس کا تجربہ ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ غیر مادری زبان سیکھنے کے دوران مادری زبان کا استعمال نقصان دہ ہے۔ راست اسلوب (Direct Method) عملی طور پر طلبہ کے لیے زیادہ مفید اور دوررس اثرات کا حامل ہے۔ اس کتاب کے مؤلفین عربی زبان کی تدریس کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔

یہ کتاب اپنے پڑھنے والوں کو عربی زبان طبعی طریقہ پر مشق تمرین جملوں اور تعبیرات کے حوالہ سے سکھاتی ہے اور اس طرح پڑھنے والوں کے اندر زبان کا فطری ذوق پیدا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ عربی زبان درست طریقہ پر لکھنے اور بولنے پر قادر ہو جاتے ہیں اور زبان سے متعلق قواعد ان کے ذہن میں غیر محسوس طریقہ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

مؤلفین کتاب نے اساتذہ کو ہدایت دی ہے کہ کتاب پڑھانے کے دوران طلبہ کو صرف ونحو کی بھول بھلیوں اور قواعد کے الٹ پھیر میں نہ الجھائیں اس لیے کہ قواعد کی راہ سے زبان کو سیکھنے کا طریقہ غیر فطری ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ قواعد کی مشق خود بخود ہو جاتی ہے۔

یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور بلاشبہ عربی زبان سیکھنے کے لیے تیر بہدف اور نسخۂ کیمیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن دمشق سے شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے بعض مدارس اور عصری جامعات نے اپنے نصاب تعلیم میں جگہ دی ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شاخوں کے نصاب تعلیم میں بھی یہ شامل ہے۔ برصغیر ہند وپاک کے مدارس اور عربی تعلیم گاہوں میں اس کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر نصاب تعلیم میں اس کتاب کی شمولیت بہت مفید ہے۔ عرب دنیا میں مقبولیت کے بعد ہندوستان میں پہلی بار کتاب کی اشاعت ہو رہی ہے۔